اسلام اور عصرِ جدید

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملّیہ اسلامیہ۔ ۲۵

اسلام اور عصرِ جدید

مدیر

اقتدار محمد خاں

نائب مدیر

محمد سعید انور

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵

اسلام اور عصرِ جدید (سہ ماہی)

(جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر)

جلد: ۵۶ جولائی ۲۰۲۴ء شمارہ: ۳

ISSN 2278-2109

اعانت زر کی شرحیں

	فی شمارہ	سالانہ	
اندرون ملک	100/روپے	380/روپے	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
پاکستان و بنگلہ دیش	4/امریکی ڈالر	15/امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
دیگر ممالک	12/امریکی ڈالر	40/امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے)

حیاتی رکنیت

اندرون ملک	5000/روپے
پاکستان و بنگلہ دیش	150/امریکی ڈالر
دیگر ممالک	400/امریکی ڈالر

اس شمارے کی قیمت 100/روپے

پرنٹنگ اسسٹنٹ: راشد احمد **ٹائٹل:** ارتج گرافکس

© جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ
مقالہ نگاروں کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

پتہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

Website: www.jmi.ac.in/zhiis E-mail:zhis@jmi.ac.in

طابع وناشر: **پروفیسر اقتدار محمد خاں** اعزازی ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۲۵

مطبوعہ : لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

بانی مدیر

ڈاکٹر سید عابد حسین (مرحوم)

مجلسِ ادارت

پروفیسر محمد شکیل (صدر)

- پروفیسر طلعت احمد
- نجیب جنگ آئی۔اے۔ایس (ریٹائرڈ)
- سید شاہد مہدی آئی اے ایس (ریٹائرڈ)
- لیفٹیننٹ جنرل محمد احمد ذکی (ریٹائرڈ)
- پروفیسر اختر الواسع
- پروفیسر محمود الحق
- پروفیسر سلیمان صدیقی

فہرست

❐	حرف آغاز	اقتدار محمد خاں	۷
❐	قرآن مجید میں صنفی مساوات کا تصور	ضیاء الدین فلاحی	۱۵
❐	اردو تفاسیر کا تقابلی جائزہ	فضل الرحمٰن اصلاحی	۳۷
❐	بدلتے حالات میں فکر اسلامی کے مسائل (ملتان میں علمی تگ ودو)	عبید اللہ فہد فلاحی	۶۱

- اسلام امن وآشتی کا مذہب — خواجہ غلام السیدین/ ترجمہ: نثار احمد فاروقی — ۹۷
- جدید تعلیم کی اہمیت ومعنویت شاہ عبدالعزیز کے فتاویٰ کی روشنی میں — محمد لعل چاند شیخ — ۱۲۱
- فقہا اور متکلمین کی کتب اصول میں 'نہی' کی بحث کا تقابلہ مطالعہ — انوار حسین — ۱۳۵

حرف آغاز

ام المومنین سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کا پیدائشی نام برہ تھا جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبدیل فرما کر میمونہ کر دیا۔سلسلہ نسب حسبِ ذیل ہے: میمونہ بنت حارث بن حَزن بن بُجیر بن ہُزم بن رُوَیبۃ بن عبداللہ بن ہلال بن عامر بن صَعْصَعَۃ بن معاویۃ بن بکر بن ہَوَازِن بن منصور بن عِکْرِمَۃ بن خَصفۃ بن قَیس بن عَیْلان بن مُضَر، جبکہ والدہ کی طرف سے سلسلۂ نسب کچھ اس طرح ہے؛ میمونہ بنت ہند بنت عوف بن زہیر بن حارث بن حماطۃ بن جرش بن اسلم بن زید بن سہل بن عمرو بن قیس بن معاویہ بن جشم بن عبدشمس بن وائل بن الغوث بن قطن بن عریب بن زہیر بن غوث بن ایمن بن الہمیسع بن حمیر بن سبأ بن یشجب بن یعرب بن قحطان۔ والد کی طرف سے اٹھارویں پشت میں مُضَر پر جا کر آپ رضی اللہ عنہا کا سلسلہ

نسب جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب سے جاملتا ہے۔آپؓ کی ولادت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت سے تقریباً ۱۶ رسال پہلے ہوئی۔

سیدہ میمونہؓ کا پہلا نکاح مسعود بن عمرو بن عمیر ثقفی سے ہوا۔انھوں نے سیدہ میمونہؓ کو طلاق دے دی۔آپؓ کا دوسرا نکاح ابورُہم بن عبدالعزیٰ سے ہوا۔کچھ عرصہ ان کے ساتھ گزارا اور ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ ماہ ذوالقعدہ ۷ رہجری کو عمرۂ قضاء (اسے عمرۂ قضاء اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے ایک سال پہلے ذی قعدہ ۶ رہجری میں آپؐ نے ایک خواب دیکھا کہ آپ مکہ معظّمہ تشریف لے گئے اور بیت اللہ کا طواف کیا۔صحابہ سے اس خواب کا ذکر فرمایا تو صحابہ نے شرف ہمراہی کا اظہار فرمایا) کے لیے آپؐ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو ہمراہ لے کر جب مقام حدیبیہ پہنچے تو کفار نے مزاحمت کی۔مختصر یہ کہ چند مشکل شرطوں کے ساتھ آپ کو واپس لوٹنا پڑا۔ان شرائط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ جب آئندہ سال عمرہ کے لیے تشریف لائیں تو جتنے دن اہل مکہ چاہیں آپ رہیں۔اسلحے کے بغیر صرف تلواریں لانے کی اجازت ہوگی اور وہ بھی میان میں۔آپؐ ماہ ذی قعدہ، ۷ رہجری کو صرف ان صحابہؓ کے ہمراہ جو صلح حدیبیہ میں آپ کے ساتھ شریک تھے تشریف لے گئے اور عمرہ ادا کیا۔

اسی دوران جب آپؐ عمرۂ قضاء سے فارغ ہوچکےتھے اور مکہ مکرمہ ہی میں تشریف فرما تھے تو حضرت عباسؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا آپ برہ (میمونہ) بنت حارث کو

اپنے رشتہ ازدواج میں لے لیں۔ چونکہ سیدہ میمونہؓ کی بہن ام الفضل لبابۃ الکبریٰؓ حضرت عباسؓ کی اہلیہ تھیں، آپؓ خاندانی طور پر سیدہ میمونہؓ کو اچھی طرح جانتے تھے اور آپ کے اعلیٰ اخلاق و کردار سے خوب واقف تھے، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کی کہ آپؐ ان سے نکاح فرمالیں۔ آپؐ نے قبول فرمایا، حضرت عباسؓ نے ۴۰۰ درہم حق مہر کے عوض آپؐ کا نکاح کردیا۔

قرارداد حدیبیہ کے مطابق مسلمانوں کے سہ روزہ قیام مکہ کی مدت ختم ہوچکی تھی لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ولیمہ کی تقریب کے سلسلے میں کچھ اور مہلت طلب کرنا چاہی، مگر اسی اثنا میں سہیل بن عمرو اور حویطب بن عبدالعزیٰ قریش کی جانب سے پہنچے اور کہا کہ مدت قیام ختم ہوگئی ہے لہٰذا آپؐ اور آپؐ کے ساتھی مدینہ واپس تشریف لے جائیں۔ آپؐ نے سنا تو ارشاد فرمایا کہ میں نے برہ جس کا اب نام میمونہ ہے، سے نکاح کرلیا ہے، اگر مزید مہلت مل جائے تو ولیمہ یہیں کروں اور تمھیں بھی اس ضیافت میں شرکت کا موقع دوں۔ اس فرمان کا مقصد صرف یہ تھا کہ آپؐ کو اس بات کی خبر تھی کہ عمرۂ قضا نے اہل مکہ کے دلوں پر گہرے نقوش مرتب کیے ہیں اور ان کی عداوتیں اور رنجشیں بہت حد تک کم ہوگئی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی جانتے تھے کہ اگر ان لوگوں نے ضیافت قبول کرلی اور انھوں نے آپؐ سے گفت وشنید کی تو مکہ کے دروازے آپؐ پر کھل جائیں گے۔ سہیل اور حویطب کو بھی اس بات کا خدشہ تھا، انھوں نے صاف صاف جواب دیا کہ ہمیں آپؐ کی ضیافت منظور نہیں، آپؐ فی الحال یہاں

سے تشریف لے جائیں۔ رسول اللہؐ نے ان کے مطالبے کو تسلیم کرلیا اور مسلمانوں کو روانگی کا حکم دے دیا۔ آپؐ مکہ سے نکل گئے اور اپنے مولیٰ حضرت ابورافعؓ کو مکہ میں چھوڑا تاکہ وہ ام المومنین میمونہؓ کو مقام سرف لے آئیں۔

یہ تو آپ کے علم میں آچکا ہے کہ سیدہ میمونہؓ کا پیدائشی نام برہ تھا جسے آپؐ نے تبدیل فرما کر میمونہ رکھ دیا۔ میمونہ کا مطلب ہوتا ہے باعث برکت۔ آپؐ کے پیشِ نظر اس نام کو منتخب کرنے کی کئی پوشیدہ حکمتیں بھی ہوں گی جو بظاہر یکے بعد دیگرے سامنے آتی رہیں۔ چنانچہ عمرۂ قضاء کے موقع پر رسول اللہؐ اور آپ کے رفقاء کی اخلاقی، روحانی اور معاشرتی لحاظ سے منزہ و پاکیزہ زندگیوں کے مظاہرے نے کفار و مشرکین مکہ کو باور کرا دیا تھا کہ اسلام حقیقتاً ایسا دین ہے جو انسانی زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہے اور جو اس کا پیروکار بن جاتا ہے، وہ نہ صرف اپنی ذات کی بلکہ دوسروں کی کردار سازی بھی بطریق احسن سرانجام دے سکتا ہے۔ آنکھوں دیکھے واقعات کو جھٹلانا کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس کا نتیجہ جو منطقی طور پر نکل سکتا تھا وہ یہی تھا کہ وہ دلی طور پر اس دین حق کے معترف ہو چکے تھے۔ ان اثرات کے علاوہ ایک اور بات جو توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی وہ خاتم المرسلینؐ کی حضرت میمونہؓ سے نکاح تھی۔ مشرکین کو اپنے وہ کرتوت یاد آرہے تھے جو انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روا رکھے تھے، ان کا جینا دوبھر کر دیا تھا، گھاٹی میں محبوس ہونے پر مجبور کر دیا تھا اور آج سے سات سال قبل آپؐ کے لیے خفیہ طور پر ہجرت کر جانے کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ رہا تھا۔ آج وہی ہستی ان کے شہر کی ایسی

خاتون سے نکاح کر کے ساتھ لے جا رہی تھی جس کے قریش کے اکثر معزز خاندانوں سے نہایت قریبی رشتے تھے اور وہ چشم تصور سے دیکھ رہے تھے کہ آج نہیں تو کل حضرت میمونہؓ کے عزیز و اقارب بھی وابستگان اسلام میں ہو جائیں گے۔ یہی وہ سوچ اور فکر تھی جو انھیں مضطرب و بے چین کیے ہوئے تھی اور وہ کرب کے دہکتے انگاروں پر لوٹ رہے تھے، ان کے لیے یہ منظر سوہان روح سے کم نہ تھا کہ جس ہستی کو وہ خانہ کعبہ میں اپنے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہ تھے، آج وہی عظیم و عالی مرتبت ہستی اپنے ہزاروں پیروکاروں کے ہمراہ اسی مقدس شہر میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جہاں چاہتے، تشریف لے جاتے تھے جبکہ اس شہر کے مکیں اپنے گھروں سے دور ٹیلوں اور پہاڑوں پر خیمہ زن تھے۔

حضرت میمونہؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح مکہ مکرمہ میں جہاں انقلاب بپا کرنے کا موجب بنا وہیں اس کے مثبت اثرات نجد کے علاقے میں بھی ظاہر ہوئے اور وہ یہ تھے کہ اہلِ نجد کا سردار زیاد بن مالک الہلالی سیدہ میمونہؓ کا بہنوئی تھا، جب اہل نجد کو اپنے قبیلے کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک طرح کی قرابت داری کا علم ہوا تو وہی لوگ جنھوں نے کبھی دھوکے کے ساتھ ۷۰ مبلغین اسلام کو شہید کرنے کا سنگین جرم کیا تھا، اب رسول اللہؐ کے حامی بن گئے اور مسلمان ہو کر اہل اسلام کی اجتماعی قوت میں اضافہ کا سبب بنے۔ اس نکاح کی یہ تھیں وہ بنیادی حکمتیں جو رسول اللہؐ کے پیش نظر تھیں، اس کے علاوہ اور بھی کئی ہوں گی جن کا علم اللہ اور اس کے رسولؐ کے پاس ہے۔

یہ آنحضرتؐ کا آخری نکاح تھا اور حضرت میمونہؓ آخری بیوی تھیں۔ اسلامی تاریخ کے عظیم جرنیل خالد بن ولید حضرت میمونہؓ کے بھانجے تھے، آپؓ کی دیگر صحابہؓ کے ساتھ بھی قریبی رشتہ داریاں ہیں۔ آپؓ سے ۴۶ حدیثیں مروی ہیں۔ سات صحیحین میں ہیں، جن میں بعض سے ان کی فقہی اور علمی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت میمونہؓ خدا تعالیٰ سے بہت ڈرتیں اور صلہ رحمی کرتی تھیں، آپؓ کو غلام آزاد کرنے کا بہت شوق تھا، آپ رضی اللہ عنہا فیاضی وسخاوت میں بھی بلند مقام رکھتی تھیں، غریب پروری اور لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قرض لینے سے بھی دریغ نہ کرتی تھیں، اسی لیے کبھی کبھی قرض لیتی تھیں اور وہ رقم مستحقین میں تقسیم کر دیتی تھیں۔ ایک بار زیادہ رقم قرض لی تو کسی نے کہا کہ آپ اس کو کس طرح ادا کریں گی؟ فرمایا: حضورؐ کا ارشاد ہے کہ: ''جو شخص قرض ادا کرنے کی نیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ خود اس کا قرض ادا کر دیتا ہے''۔ میں ضروری اُمور کی تکمیل کے لیے قرض لے رہی ہوں، میرا مقصد نیک ہے اور نیت ادائیگی کی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ ضرور بندوبست کر دے گا''۔

آپ رضی اللہ عنہا نے دین کی تعلیم کو امت تک پہنچانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے، گھریلو مسائل اور خانگی امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے روشناس کرایا ہے، بالخصوص خواتین سے متعلق اکثر طہارت و پاکیزگی کے مسائل احادیث مبارکہ میں آپؓ کے حوالے سے مذکور ہیں۔ ایک مرتبہ سیدہ میمونہؓ کے بھانجے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس حالت میں

تشریف لائے کہ آپ کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ام المومنین نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمانے لگے کہ مجھے ام عمار کنگھا کرتی ہے لیکن یہ دن ان کے خاص ایام کے چل رہے ہیں، اس لیے انھوں نے کنگھا نہیں کیا۔آپؓ نے فرمایا کہ شریعت کا مسئلہ ایسے نہیں جیسے تم نے سوچ رکھا ہے بلکہ ان دنوں میں بھی وہ آپ کو کنگھا وغیرہ کرسکتی ہے پھر اس پر دلیل کے طور پر اپنا ذاتی عمل پیش کیا کہ جب ہمارے خاص ایام ہوتے تھے اس دوران بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری گود میں سر رکھ آرام فرما لیتے اور قرآن کریم کی تلاوت بھی فرماتے تھے.....اس کے بعد انھیں سمجھایا کہ بیٹا! خاص ایام کے اثرات ہاتھوں تک سرایت نہیں کرتے۔احکامِ نبویؐ کی تعمیل ہر وقت حضرت میمونہؓ کے پیشِ نظر رہتی تھی۔ایک دفعہ ان کی کنیز بدیہٗ حضرت ابن عباسؓ کے گھر گئی تو دیکھا کہ میاں بیوی کے بستر دور دور بچھے ہیں، خیال ہوا کہ شاید کچھ رنجش ہوگئی ہے، لیکن دریافت سے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباسؓ بیوی کے خاص ایام میں اپنا بستر ان سے الگ کر لیتے ہیں۔کنیز نے آکر حضرت میمونہؓ کو یہ ماجرا سنایا تو آپؓ نے فرمایا:

''ان سے جا کر کہو کہ رسول اللہؐ کے طریقے سے اس قدر کیوں اعراض ہے؟ آپؐ ہم لوگوں کے بچھونوں پر برابر آرام فرماتے تھے''۔

جس مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کے بعد آپؓ کو قربت بخشی بالکل اسی مقام پر آپؓ خدا کے قرب میں چلی گئیں۔یعنی مقام سرف میں آپ رضی اللہ عنہا کا ولیمہ ہوا اور اسی مقام پر آپؓ نے وفات پائی۔۵۱ھ ہجری میں سیدنا امیر معاویہؓ کے دور

امارت میں آپؓ حج یا عمرہ کی غرض سے مکہ مکرمہ تشریف لائیں، یہاں آ کر آپؓ کی طبیعت ناساز ہوئی، اپنے بھانجے حضرت یزید بن الاصمؒ کو فرمایا کہ مجھے مکہ سے لے چلو اس لیے کہ رسولؐ نے فرمایا تھا کہ آپ کا انتقال مکہ میں نہیں ہوگا۔ یزید بن الاصمؒ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ام المومنین سیدہ میمونہؓ کو مرض کی حالت میں مکہ سے لے کر چلے، جب مقام سرف پر پہنچے تو آپؓ کا انتقال ہو گیا۔ آپؓ کی نماز جنازہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے پڑھائی۔

اقتدار محمد خان

ضیاء الدین فلاحی *

قرآن مجید میں صنفی مساوات کا تصور

عورت کی اصلی نشوونما

قرآن مجید خالق کائنات کی آخری کتاب ہے۔ اس الہامی کتاب نے افکار واعمال میں انسان کی ہدایت کا مکمل انتظام کیا ہے۔ ان احکامات وتعلیمات کو انسانی معاشرہ میں نافذ وجاری کرنے کے لیے انبیاء ورسل کو اسوہ ونمونہ بنایا گیا۔ قرآن حکیم جو انسانی تمدن کی تہذیب وتزئین کے لیے نازل ہوا، اس نے تمدن کی دو اہم اکائیوں: مرد اور عورت کو بنیادی مخاطب بنایا ہے اور قوموں کے عروج وزوال پر موثر بیانیہ پیش کیا ہے۔ اس کا ایک بیانیہ یہ ہے کہ وہ قومیں/تہذیبیں زوال سے نہیں بچ سکیں جنھوں نے عورتوں کے ساتھ انصاف کا معاملہ نہیں کیا۔

انسانی تمدن میں سب سے بنیادی مسئلہ مرد وعورت کی حقیقی وفطری حیثیت کی شناخت وادراک اور اسے برتنے کا رہا ہے۔ اس پیچیدہ گتھی کو سلجھانے میں وہی مذہب/تہذیب کامیاب رہی جس نے انسانی/جسمانی ساخت اور اس کی فطری خوبیوں اور کمزوریوں کی رعایت کی ہے۔ اس مسئلے

☆ پروفیسر ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ای میل: ziauddin@myamu.ac.in

میں حد اعتدال سے تجاوز کرنے یا افراط اور تفریط کا رویہ اختیار کرنے کے نتیجے میں آج تک عورت کا نہ تعارف مکمل ہو سکا، نہ اسے اس کا حق مل سکا اور نہ اس کے فرائض متعین کیے جا سکے۔ وہ ہنوز انسان کی حیوانی خواہشات کا کھلونا بنائی جاتی رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء- ۱۹۷۹ء) نے اپنی رجحان ساز کتاب ''پردہ'' میں عورت کی ''اصلی اٹھان'' کے زیر عنوان ایک جگہ لکھا ہے:

> ''...جہلا تو درکنار علماء اور پیشوایان مذہب تک میں مدتوں تک یہ سوال زیر بحث رہا کہ آیا عورت انسان بھی ہے یا نہیں؟ اور خدا نے اس کو روح بخشی ہے یا نہیں؟ ہندو مذہب میں ویدوں کی تعلیم کا دروازہ عورت کے لیے بند تھا۔ بودھ مت میں عورت سے تعلق رکھنے والے کے لیے نروان کی کوئی صورت نہ تھی۔ مسیحیت اور یہودیت کی نگاہ میں عورت ہی انسانی گناہ کی بانی مبانی اور ذمے دار تھی۔ یونان میں گھر والیوں کے لیے نہ علم تھا نہ تہذیب وثقافت تھی اور نہ حقوق مدنیت، یہ چیزیں جس عورت کو ملتی تھیں وہ رنڈی ہوتی تھی۔ روم اور ایران اور چین اور مصر اور تہذیب انسانی کے دوسرے مرکزوں کا حال بھی قریب قریب ایسا ہی تھا۔ صدیوں کی مظلومی اور محکومی اور عالم گیر حقارت کے برتاؤ نے خود عورت کے ذہن سے بھی عزت نفس کا احساس مٹا دیا تھا... مرد اس پر ظلم وستم کرنا اپنا حق سمجھتا تھا اور وہ اس کے ظلم کو سہنا اپنا فرض جانتی تھی۔ غلامانہ ذہنیت اس حد تک اس میں پیدا کر دی گئی تھی کہ وہ فخر کے ساتھ اپنے آپ کو شوہر کی 'داسی' کہتی تھی۔ 'پتی ورتا' اس کا دھرم تھا اور پتی ورتا کے معنی یہ تھے کہ شوہر اس کا معبود اور دیوتا ہے—اس ماحول میں جس نے نہ صرف قانونی اور عملی حیثیت سے بلکہ ذہنی حیثیت سے بھی ایک عظیم انقلاب برپا کیا وہ اسلام ہے۔ اسلام ہی نے عورت اور مرد کی ذہنیتوں کو بدلا ہے۔ عورت کی عزت اور اس کے حق کا تخیل ہی انسان کے دماغ میں اسلام کا پیدا کیا ہوا ہے۔ آج حقوقِ نسواں

اور تعلیمِ نسواں اور بیداری اناث کے جو الفاظ آپ سن رہے ہیں یہ سب اسی انقلاب انگیز صدا کی بازگشت ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بلند ہوئی تھی اور جس نے افکار انسانی کا رخ ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔''[۱]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر علم و تحقیق کی دنیا کے ایک دوسرے عظیم اسکالر محمد قطب[۲] (۱۹۰۶-۱۹۶۶ء) کی رائے بھی نقل کر دی جائے تا کہ آئندہ کی بحث کی تفہیم میں آسانی ہو۔ اپنی کتاب (شبہاتٌ حول الاسلام) ''اسلام اور جدید ذہن کے شبہات'' (اردو ترجمہ) میں ''مرد اور عورت میں امتیاز کی بنیاد'' کے ذیل میں رقم طراز ہیں:

''...لیکن انسانی حیثیت سے مرد و زن میں کامل مساوات تسلیم کرنے، اور انھیں یکساں حقوق کا حامل قرار دینے کے بعد بھی جہاں تک زندگی میں دونوں اصناف کے وظیفہ حیات کا تعلق ہے، اسلام ان کے باہمی فرق کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اسلام کے خلاف انجمنوں اور ان کے حامی ادیبوں، سماجی مصلحین اور نوجوانوں کے شور و غوغا کی اصل وجہ اسلام کا یہی تصور ہے... بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کیا مرد اور عورت ایک ہی صنف سے تعلق رکھتے ہیں؟ یا یہ دونوں دو الگ الگ اصناف ہیں؟ کیا زندگی میں ان کا وظیفہ یکساں ہے یا مرد اور عورت ہونے کی حیثیت سے ان کے فرائض کے دائرے جدا جدا ہیں؟ یہ سوالات بڑے پیچیدہ ہیں، مگر انہی کے سمجھنے پر مرد و زن کے مسئلے کے حل کا انحصار ہے۔''[۳]

صنفی مساوات اور قوانینِ فطرت

قرآن مجید کی متعدد آیات سے یہ اساسی تصور ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے کہ فطرت نے زوجین/صنفین کو پیدا کیا اور دونوں کے اندر ایک دوسرے کے لیے کشش رکھی ہے۔ یہ صنفی کشش اپنے اندر جذب و انجذاب کے بے شمار اسباب و داعیات رکھتی ہے۔ یہ کشش حیوانوں کے اندر بھی ہے البتہ اس کا مقصد محض بقائے نوع ہے۔ ان متعدد اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ صنفی کشش تمدن کی تخلیق میں

چاشنی کی حیثیت رکھتی ہے تا کہ زوجین عمل مباشرت کو کسی اور کا نہیں اپنا کام سمجھ کر انجام دیں۔ یہ عمل عورت کے اندر شرم وحیا اور فرار ورکاوٹ کا بھی باعث بنتا ہے تا کہ انسان/مرد محض صنفی مقناطیسیت کا غلام اور بندہ نہ بن جائے۔ اسی طرح تمدن کی تزئین وآرائش اور استحکام کے لیے انسان کے دل میں اولاد کی محبت تمام حیوانات سے زیادہ رکھی گئی ہے۔ یہ نتیجہ ہے دراصل خونی رشتوں کی محبت اور خاندانی ومصاہرت کے رشتوں کے درمیان محبتوں اور محبوبوں کے اشتراک کا۔[۴]

مدنیت صالحہ، اسلام کا اساسی تصور ہے۔ چنانچہ قرآن مجید اس تصور کی افزائش کے لیے عدل وانصاف کی تلقین کرتا ہے اور افراط وتفریط سے مرد وزن کو بچاتا ہے۔ اگر یہ دونوں قدریں عملی رویوں کا جزو نہ بنیں تو تمدن پر حیوانیت اور بہیمیت کا غلبہ ہو جاتا ہے مثلاً تمدن کا پورا لٹریچر ہیجان انگیزی کا باعث ہوتا ہے۔ افسانے، اشعار، تصویریں، مجسمے، عبادت خانے اور محلات سب اسی نشہ کی افزائش کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ مخلوط سوسائٹی میں عورت کے جسم کی نمائش اور عریانیت قابل نفرت چیز نہیں رہ جاتی ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں ہمیں اس ضمن میں رہنمائی ملتی ہے:

۱۔ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (الذاریات:۴۹) اور ہم نے ہر چیز کو جوڑے جوڑے بنایا۔

۲۔ جَعَلَ لَكُم مِّنْ اَنفُسِكُمْ اَزْوَاجاً وَمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجاً يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ (الشوری:۱۱) اللہ نے تمہارے لیے خود تمہیں میں سے جوڑے بنائے اور جانوروں میں سے بھی جوڑے بنائے۔ اس طریقے سے وہ تم کو روئے زمین پر پھیلاتا ہے۔

۳۔ خَلَقَ لَكُم مِّنْ اَنفُسِكُمْ اَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً (الروم:۲۱) اللہ نے تمہارے لیے خود تمہیں میں سے جوڑے بنائے تا کہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان مودت اور رحمت رکھ دی۔

۴۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنتُمْ لِبَاسٍ لَّهُنَّ (البقرہ:۱۸۷) وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

۵۔ حَمَلَتْهُ اُمُّهُ وَهْناً عَلَى وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِيْ عَامَيْنِ (لقمان:۱۴)
اس کی ماں نے جھٹکے پر جھٹکے اٹھا کر پیٹ میں رکھا پھر وہ دوسال کے بعد ماں کی چھاتی سے جدا ہوا۔

۶۔ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاء وَالْبَنِيْنَ (آل عمران: ۱۴) لوگوں کے لیے خوش آئند ہے مرغوب چیزوں کی محبت جیسے عورت اور اولاد۔

۷۔ يَـأَيُّهَـا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثٰى وَجَعَلْنكُمْ شُعُوباً وَّقَبَـائِلَ لِتَعَارَفُوْا (الحجرات:۱۳) لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر تمہاری قومیں اور تمہارے قبیلے بنا دیئے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔

۸۔ وَاُوْلُواْ الأَرْحَـامِ بَعْضُهُمْ اَوْلَى بِبَعْضٍ فِيْ كِتَابِ اللّهِ (الانفال: ۷۵) اور اللہ کے قانون میں رشتہ دار دوسرے کی وراثت کے زیادہ حقدار ہیں۔

قانونِ زوجیت کے اصول

مذکورہ بالا آیات میں صنفی مساوات کے مسئلے پر مختلف جہات سے روشنی پڑتی ہے۔ ایک پہلو فطرت کے حقائق اور حکمت کے اصول کا ہے۔ اس ضمن میں چند مفسرین کی آراء پیش کی جاتی ہیں:

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے سورہ الذاریات ۴۹ کے تحت قانون زوجیت کے تین اصول بیان کیے ہیں:

(الف) اللہ تعالیٰ کا فارمولہ تخلیق ناپاک اور ذلیل نہیں ہے بلکہ اپنی اصل کے اعتبار سے پاک اور محترم ہے۔ کارخانہ کے مخالف اس کو گندہ اور قابل نفرت قرار دے کر اس سے اجتناب کر سکتے ہیں مگر خود کارخانہ کا صانع کبھی نہ چاہے گا کہ اس کا کارخانہ بند ہو جائے۔

(ب) فعل اور انفعال دونوں اس کارخانے کو چلانے کے لیے یکساں ضروری ہیں، فاعل اور منفعل

دونوں کا وجود اس کارگاہ میں یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ نہ فاعل کی حیثیتِ فعلی میں کوئی عزت ہے اور نہ منفعل کی حیثیتِ انفعالی میں کوئی ذلت۔ جو احمق اور اناڑی ہیں وہ اس کے زوجِ فاعل کو زوجِ منفعل کی جگہ یا منفعل کو زوجِ فاعل کی جگہ رکھنے کا خیال کر سکتے ہیں اور کامیابی کی امید رکھ کر مزید حماقت کا ثبوت دے سکتے ہیں۔

(ج) فعل اپنی ذات میں قبول اور انفعال پر بہر حال ایک طرح کی فضیلت رکھتا ہے۔ اس میں عزت و ذلت کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ جس طرح وقوعِ فعل کے لیے فاعل اور منفعل دونوں کا وجود ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ فاعل میں غلبہ اور قوتِ تاثیر ہو اور منفعل میں مغلوبیت اور قبولِ اثر کی استعداد، اگر کپڑے میں بھی وہی سختی ہو جو سوئی میں ہے تو سینے کا فعل پورا نہیں ہو سکتا، اگر زمین میں وہ نرمی نہ ہو جس کی وجہ سے کدال اور ہل کا غلبہ قبول کرتی ہے تو زراعت اور تعمیر ناممکن ہو جائے۔''

''پس زوجین میں سے زوجِ فاعل کی طبیعت کا اقتضا یہی ہے کہ اس میں غلبہ اور شدت اور تحکم ہو جس کو مردانگی اور رجولیت سے تعبیر کیا جاتا ہے—— اس کے برعکس زوجِ منفعل کی فطرتِ انفعالیہ کا یہی تقاضا ہے کہ اس میں نرمی اور نزاکت اور لطافت اور تاثر ہو جسے انوثت یا نسائیت کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اس راز کو نہیں جانتے وہ یا تو فاعل کی ذاتی فضیلت کو عزت کا ہم معنی سمجھ کر منفعل کو بالذات ذلیل قرار دے بیٹھتے ہیں یا سرے سے اس حقیقت کا انکار کر کے منفعل میں بھی وہی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو فاعل میں ہونی چاہئیں۔ لیکن جس انجینئر نے ان دونوں پُرزوں کو بنایا ہے وہ ان کو مشین میں اس طور پر نصب کرتا ہے کہ عزت میں دونوں یکساں اور تربیت و عنایت میں دونوں برابر، مگر فعل و انفعال کی طبیعت میں غالبیت اور مغلوبیت کی مقتضی ہے۔ وہی ان میں پیدا ہوتا ہے کہ وہ تزویج کے منشا کو پورا کر سکیں۔ نہ یہ کہ دونوں ایسے پتھر بن جائیں جو ٹکرا تو سکتے ہیں مگر آپس میں کوئی امتزاج اور کوئی ترکیب قبول نہیں کر سکتے۔ خلاصہ یہ کہ اس آیت

میں قانون زوجی (Law of sex) کی ہمہ گیری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔''[۵]

مولانا امین احسن اصلاحیؒ (۱۹۰۴- ۱۹۹۷ء) نے سورہ یٰسین آیت: ۳۶ اور الذاریات آیت: ۴۹ میں زوجیت کے تصور پر بحث کی ہے اور کائنات کی ہر چیز میں زوجیت کو توحید کے لیے ایک دلیل قرار دیا ہے۔ ان کی تشریح میں بالواسطہ انوثت/نسائیت پر بھی روشنی پڑتی ہے، تحریر کرتے ہیں:

''لفظ زوج انواع واقسام کے معنی میں آتا ہے اور جوڑے جوڑے کی مفہوم میں بھی۔ اسی طرح انسانوں کو دیکھیے تو ان کی شکلوں، رنگوں، قامتوں اور زبانوں میں عظیم فرق نظر آئے گا اور ساتھ ان کے اندر جوڑے جوڑے ہونے کا وصف بھی پایا جاتا ہے۔ یہی حال عالم کے اس حصے کا ہے جو ہمارے علم کی رسائی سے باہر ہے..... اس کے تنوع کے اندر مقصد کی ہم آہنگی اور اس کے تضاد کے اندر توافق کی سازگاری پائی جاتی ہے۔''[۶]

صنفی کشش اور حیاتیات

ڈاکٹر اسرار احمدؒ (۱۹۳۲- ۲۰۱۰ء) نے مذکورہ دونوں آیات سے آفاق میں زوجیت کے ذریعہ توحید و آخرت پر گفتگو کی ہے۔ الذاریات کے ضمن میں تحریر کرتے ہیں کہ ''یہاں پر اس حوالے سے صرف یہ نکتہ سمجھ لیجیے کہ اس مفہوم کی آیات آخرت سے متعلق عقلی دلیل فراہم کرتی ہیں یعنی جب ہر شی کا جوڑا ہے تو دنیا کا بھی جوڑا ہونا چاہیے اور ظاہر ہے کہ دنیا کا جوڑا آخرت ہے۔''[۷]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے الشوریٰ آیت: ۱۱، اور البقرہ آیت: ۲۲۳ کے ذریعہ انسان کی حیوانی فطرت اور اس کے متقضیات پر روشنی ڈالی ہے۔ حیاتیاتی نقطہ نظر (Biological Fact) سے بہترین تشبیہ جو عورت اور مرد کو دی جاسکتی ہے انھوں نے ان دونوں آیتوں سے تین مزید اصول وضع کیے ہیں:

(الف) اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کو اس لیے نہیں پیدا کیا ہے کہ اس کے چند افراد زمین پر اپنے نفس کی پرورش کریں اور بس ختم ہو جائیں بلکہ اس کا ارادہ اجلِ معین تک اس نوع کو باقی رکھنے

کا ہے۔۔۔پس جو قانون خدا کی طرف سے ہوگا وہ اچھی صنفی میلان کو کچلنے والا اور فنا کرنے والا نہیں ہوسکتا، اس سے نفرت اور کلی اجتناب کی تعلیم دینے والا نہیں ہوسکتا بلکہ اس میں لازماً ایسی گنجائش رکھی جائے گی کہ انسان اپنی فطرت کے اس اقتضا کو پورا کر سکے۔

(ب) جس طرح کھیتی میں کسان کا کام محض بیج پھینک دینا ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس کو پانی دے، کھاد مہیا کرے اور اس کی حفاظت کرتا رہے اسی طرح عورت بھی وہ زمین نہیں جس میں ایک جانور چلتے پھرتے کوئی بیج پھینک جائے اور وہ ایک خودرو درخت اگا دے بلکہ جب وہ بارآور ہوتی ہے تو درحقیقت اس کی محتاج ہوتی ہے کہ اس کا کسان اس کی پرورش اور اس کی رکھوالی کا پورا پورا بار سنبھالے۔

(ج) انسان کے زوجین میں جو صنفی کشش ہے وہ حیاتیاتی حیثیت (Biologically) سے اس نوعیت کی ہے جو دوسری انواع حیوانی میں پائی جاتی ہے۔ ایک صنف کا ہر فرد صنفِ مقابل کے ہر فرد کی طرف حیوانی میلان رکھتا ہے اور تناسل کا زبردست داعیہ، دونوں صنفوں کے ان تمام افراد کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتا ہے جن میں تناسل کی صلاحیت بالفعل موجود ہے۔ پس فاطر کائنات کا بنایا ہوا قانون انسان کی حیوانی فطرت کے اس کمزور پہلو سے بے پرواہ نہیں ہوسکتا، کیوں کہ اس میں صنفی انتشار کی طرف ایسا شدید میلان چھپا ہوا ہے جو تحفظ کی خاص تدابیر کے بغیر قابو میں نہیں رکھا جاسکتا ہے اور ایک مرتبہ اگر وہ بے قابو ہو جائے تو انسان کو پورا حیوان بلکہ حیوانات میں بھی سب سے ارذل بن جانے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِی اَحْسَنِ تَقْوِیْم ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ (التین: ۴-۵)[۸]

۵۔ مولانا شبیر احمد عثمانی (۱۸۸۷-۱۹۴۹ء) نے سورہ بقرہ آیت: ۲۲۳ میں تخم ریزی کا مقام ومحل فرج قرار دیا ہے اور مجامعت کے اسلامی طریقے کی وضاحت کی ہے۔ مولانا عثمانی نے یٰسین: ۳۶ اور الذاریات: ۴۹ کی تفسیر میں تقابل اور تماثل پر گفتگو کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ مقابلہ یا مماثلت ان چیزوں میں ہوسکتی ہے جو کسی درجہ میں فی الجملہ اشتراک رکھتی ہوں، خالق ومخلوق کی کسی حقیقت میں اشتراک ہی نہیں ہے۔[۹]

۶۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے سورہ البقرہ کی مذکورہ آیت پر سیر حاصل گفتگو کی ہے ان کی بحث کا خلاصہ ذیل کے نکات میں پیش کیا جاتا ہے:

عورتوں کے لیے کھیتی کے استعارہ میں ایک سیدھا سادا پہلو تو یہ ہے کہ جس طرح کھیتی کے لیے قدرت کا بنایا ہوا یہ ضابطہ ہے کہ تخم ریزی ٹھیک موسم میں اور مناسب وقت پر کی جائے، نیز بیج کھیت میں ہی ڈالے جاتے ہیں کھیت سے باہر نہیں پھینکے جاتے۔ کوئی کسان اس ضابطہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا اسی طرح عورت کے لیے فطرت کا یہ ضابطہ ہے کہ ایام ماہواری کے زمانے میں یا کسی غیر محل میں اس سے قضائے حاجت نہ کی جائے۔

مولانا کہتے ہیں کہ **فَاْتُوا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ** (پس اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ) میں بیک وقت دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو اس آزادی، بے تکلفی، خود مختاری کی طرف جو ایک باغ یا کسی کے مالک کو (حاصل ہوتی ہے) اور دوسری اس پابندی، ذمہ داری اور احتیاط کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی والا اپنے باغ یا کھیتی کے معاملہ میں ملحوظ رکھتا ہے۔ دوسری چیز کی طرف اشارہ "حَـــرْث" کا لفظ کر رہا ہے اور پہلی چیز کی طرف **اَنّٰى شِئْتُمْ** کے الفاظ۔

مولانا موصوفؒ قدرت کی منشا پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''انسان جب اپنے عیش وسرور کے اس باغ میں داخل ہوتا ہے تو قدرت چاہتی ہے کہ وہ اپنے اس نشہ سے سرشار ہو لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس کے سامنے قدرت نے رکھ دی ہے کہ یہ کوئی جنگل نہیں بلکہ اس کا اپنا باغ ہے اور یہ کوئی ویرانہ نہیں بلکہ اس کی اپنی کھیتی ہے۔ اس وجہ سے وہ اس میں آنے کو تو سو بار آئے اور جس شان، جس آن، جس سمت اور جس پہلو سے آئے لیکن اس باغ کا باغ ہونا اور کھیتی کا کھیتی ہونا یاد رکھے۔ اس کے کسی آنے میں بھی اس حقیقت سے غفلت نہ ہو۔ اپنی کھیتی سے متعلق ہر کسان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس سے اسے برابر نہایت اچھی فصل حاصل ہوتی رہے مناسب وقت پر اس میں ہل چلتے رہیں، ضرورت کے مطابق اس کو کھاد اور پانی ملتا رہے، موسمی آفتوں سے وہ محفوظ رہے۔ آئندہ وروند،

چرند و پرند اور دشمن اور چور اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں جب وہ اس کو دیکھے تو اس کی طراوت و شادابی اس کو خوش کر دے اور جب وقت آئے تو وہ اپنے پھلوں اور پھولوں سے اس کا دامن بھر دے۔''

مولانا اصلاحی مزید لکھتے ہیں:

''قرآن نے عورت کے لیے کھیتی کے استعارے میں یہ ساری باتیں جمع کر دی ہیں اور اس استعارے نے ان لوگوں کے نظریے کی تو جڑ ہی کاٹ دی ہے جو خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیمیں چلاتے ہیں۔ اس لیے کہ کھیتی سے متعلق یہ رہنمائی تو معقول قرار دی جا سکتی ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ اور اچھی سے اچھی پیداوار کس طرح حاصل کی جائے لیکن یہ بات بالکل غیر منطقی ہے کہ لوگوں کو اس بات کے سبق پڑھائے جائیں کہ وہ بیج تو زیادہ سے زیادہ ڈالیں لیکن فصل کم سے کم حاصل کریں۔ اس قسم کی نامعقول منطق صرف نادانوں ہی کو سوجھ سکتی ہے۔''[۱۰]

۷۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے نِسَائُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ کے ضمن میں لکھا ہے کہ آیت کے الفاظ سے ضمناً روشنی منع حمل کے مسئلے پر بھی پڑ جاتی ہے۔ کون کاشتکار زمین میں بیج محض ضائع کر دینے کے لیے ڈالے گا۔[۱۱]

صنفی مساوات اساسیاتِ

اساسیات سے متعلق ایک بحث فطرت انسانی اور اس کی مقتضیات کی ہے، جس میں دیکھنا یہ ہے کہ حیوانات اور انسانوں کی فطری سرشت میں کیا اور کتنا فرق ہے؟ اس مقصد کے لیے ہی حدود شرعی مقرر فرمائی گئی ہیں تاکہ انسان افراط و تفریط سے محفوظ رہ سکے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَمَن يَّتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ (الطلاق:۱) ''اور جو کوئی اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا۔''

قرآن مجید دونوں صنفوں کے درمیان جس قسم کے تعلقات کی نشوونما چاہتا ہے اسے چند

آیات میں بیان کرتا ہے:

۱۔ خَلَقَ لَكُم مِّنْ اَنفُسِكُمْ اَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً (الروم:۲۱) ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے خود تمہیں میں سے جوڑے بنائے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان مودت اور رحمت رکھ دی۔''

۲۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٍ لَّهُنَّ (البقرہ:۱۸۷) ''وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو''۔ مولانا مودودی نے اس آیت کے ضمن میں چند باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

اول: تخلیق زوجین کا مقصد صرف بقائے نسل کے لیے بنایا گیا ہے۔ لیکن اس آیت میں زوجیت کا ایک بالاتر مقصد بھی ہے اور وہ یہ کہ ان کا تعلق محض شہوانی نہ ہو بلکہ اُنس ومحبت کا ہو، دل سے لگاؤ اور روحوں کے اتصال کا تعلق ہو وہ ایک دوسرے کے راز دار اور شریکِ رنج وراحت ہوں ان کے درمیان ایسی معیت اور دائمی وابستگی ہو جیسے لباس اور جسم میں ہوتی ہے۔ دونوں صنفوں کا یہی تعلق انسانی تمدن کی عمارت کا سنگ بنیاد ہے۔ اس کے ساتھ لِتَسْكُنُوا اِلَيْهَا سے اشارہ کر دیا گیا کہ عورت کی ذات مرد کے لیے سرمایہ سکون وراحت اور عورت کی فطری خدمت یہی ہے کہ وہ اس جدوجہد اور ہنگامہ عمل کی مشقتوں بھری دنیا میں سکون وراحت کا ایک گوشہ مہیا کرے۔ یہ انسان کی خانگی زندگی ہے جس کی اہمیت کو مادی منفعتوں کی خاطر اہل مغرب نے نظر انداز کر دیا ہے حالاں کہ تمدن عمران کے شعبوں میں جو اہمیت دوسرے شعبوں کی ہے وہی اس کی بھی ہے اور تمدنی زندگی کے لیے یہ بھی اتنا ضروری ہے جتنے دوسرے شعبے ضروری ہیں۔

دوم: یہ صنفی تعلق صرف زوجین کی باہمی محبت ہی کا مقتضیٰ نہیں ہے بلکہ اس امر کا بھی مقتضی ہے کہ اس تعلق سے جو اولاد پیدا ہو اس کے ساتھ بھی ایک گہرا روحانی تعلق ہو۔ فطرت الٰہی نے اس کے لیے انسان کی اور خصوصاً عورت کی جسمانی ساخت اور حمل ورضاعت کی طبیعی صورت ہی میں ایسا انتظام کر دیا ہے کہ اس کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں اولاد کی محبت پیوست ہو جاتی ہے۔ طبیعت کا یہ فلسفہ ذیل کی آیات سے مزید مستحکم ہو جاتا ہے:

۱۔ حَمَلَتْهُ اُمُّهُ وَهْناً عَلَى وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِيْ عَامَيْنِ (لقمان:۱۴)

۲۔ حَمَلَتْهُ اُمُّهُ كُرْهاً وَوَضَعَتْهُ كُرْهاً وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلاثُونَ شَهْراً (احقاف:۱۵)

۳۔ يَآيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَاُنثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوباً وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا (الحجرات:۱۳)

ارحام اور انساب اور مصاہرت کے رشتے دراصل انسانی تمدن کے ابتدائی اور طبعی موسسات ہیں اور ان کے قیام کا انحصار اس پر ہے کہ اولاد اپنے معلوم و معروف ماں باپ سے ہو اور انساب محفوظ ہوں۔

سوم: انسانی فطرت کا یہ بھی اقتضا ہے کہ اپنی گاڑھی کمائی میں سے کچھ اپنے عزیزوں کے لیے چھوڑے جن کے ساتھ وہ تا عمر رحمی رشتوں میں بندھا رہا۔ وَاُوْلُواْ الاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلَى بِبَعْضٍ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ (الانفال:۷۵) ''اور اللہ کے قانون میں رشتہ دار ایک دوسرے کی وراثت کے زیادہ حقدار ہیں'' سے اس ضمن میں رہنمائی ملتی ہے۔[۱۲]

لباس کے لغوی و صنفی فوائد

صاحب تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٍ لَّهُنَّ (البقرہ:۱۸۷) کے تحت بعض بلیغ اشارے کیے ہیں۔ مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر ذیل میں چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں:

> ''میاں بیوی ایک دوسرے کے جنسی جذبات و داعیات کے لیے پردہ فراہم کرتے ہیں ان کے اندر جو جنسی میلان ابھرتے ہیں وہ ان کی تسکین اور آسودگی کے لیے خود اپنے اندر سامان رکھتے ہیں اس وجہ سے کبھی ان کے عریاں اور بے نقاب ہونے کی نوبت نہیں آتی، اگر یہ نہ ہو تو جذبات کا ہیجان، جنسی انارکی کا ایک ایسا طوفان برپا کر دے کہ کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہ رہ جائے۔ جسم کے جو حصے اپنے اندر جنسی کشش رکھتے ہیں وہ عریاں ہونے

کے لیے زور لگائیں، زبان وقلم پر فحاشی کا بخار وہذیان طاری ہوجائے۔ دل ہرزہ گرد اور نگاہ بالکل آوارہ ہوکر رہ جائے۔ ہمارے نفس کے ان سارے عیوب کی پردہ پوشی اگر ہوسکتی ہے تو صرف بیوی کے لیے شوہر کے ذریعہ سے ہوسکتی ہے اور شوہر کے لیے بیوی کے ذریعہ سے۔ حیا باطنی لباس ہے بلکہ سچ پوچھیے تو اصلی لباس یہی ہے۔ باطن کا یہی لباس ہے جس کے سبب سے ہم ظاہر کے لباس کو اختیار کرتے ہیں اور حیا قائم رکھنے میں جو مدد شوہر کو بیوی سے اور بیوی کو شوہر سے ملتی ہے وہ کسی اور چیز سے بھی نہیں ملتی۔''

دوسرا پہلو اس کا آرائش وزینت ہے جو ستر پوشی کے بعد کا مرحلہ ہے اس کے ذریعہ انسان تمدن وترقی کے مرحلے میں داخل ہوتا ہے یہی چیز بلند درجے کے ساتھ دونوں صنفوں کو ایک دوسرے سے حاصل ہوتی ہے۔

تیسرا پہلو سردی، گرمی، اور دشمن کے خطرات سے حفاظت کا ہے جو لباس سے حاصل ہوتا ہے۔ اخلاقی پہلو سے ٹھیک یہی حال عورت کا مرد کے لیے اور مرد کا عورت کے لیے ہے۔ عورت مرد کے لیے زرہ بکتر ہے اور مرد عورت کے لیے زرہ بکتر۔ جب یہ دونوں اپنے اپنے زرہ اور بکتر سے آراستہ ومسلح ہوں تو شیطان کے حملے ان میں سے کسی پر کارگر نہیں ہوتے۔[۱۳]

اسلامی معاشرت کے ضابطے

انسانی تمدن کی شیرازہ بندی کے لیے ہمیشہ ضابطوں اور قوانین کی ضرورت پیش آتی ہے۔ قرآن مجید نے اس ضمن میں مرد وعورت کو مختلف حدود کا پابند بنایا ہے۔ چنانچہ اس نے محرمات اور غیر محرمات کی دو فہرستیں فراہم کیں اور ان کی حکمتوں پر بحث کی ہے۔ سورہ نساء رکوع: ۴ میں محرمات کی فہرست فراہم کی گئی ہے جن میں صنفی کشش کو ختم کردیا گیا ہے۔ قرآن نے حرمتِ زنا (بنی اسرائیل: ۳۲) اور اعلانیہ نکاح (النساء: ۲۴-۲۵) پر تفصیلی کلام کیا ہے۔ صنفی میلان کو خاندان کی تخلیق اور اس کے استحکام کا ذریعہ بنانے کے بعد اسلام نے خاندان کی تنظیم کا اہتمام کیا ہے۔ اور قانون فطرت کے پورے توازن کی رعایت کی ہے۔ عورت اور مرد کے حقوق کو متعین کرتے ہوئے عدل وانصاف کو ملحوظ رکھا

ہے۔[۱۴] اسلام نے خاندان کی تنظیم جن قواعد کے تحت کی ہے ان میں مرد کی قوامیت کا مسئلہ سرفہرست ہے۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاء بِمَا فَضَّلَ اللّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُواْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ (النساء:۳۴) ''مرد عورتوں پر قوام ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں''۔

آیت بالا کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودی لکھتے ہیں:

قوّام یا قیّم اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی فرد یا ادارے یا نظام کے معاملات کو درست حالت میں چلانے اور اس کی حفاظت ونگہبانی کرنے اور اس کی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہو۔ یہاں فضیلت بمعنی شرف اور کرامت اور عزت نہیں ہے جیسا کہ ایک عام اردو خواں آدمی اس لفظ کا مطلب لے گا بلکہ یہاں یہ لفظ اس معنی میں ہے کہ ان میں سے ایک صنف (یعنی مرد) کو اللہ نے طبعاً بعض ایسی خصوصیات اور قوتیں عطا کی ہیں جو دوسری صنف (یعنی عورت) کو نہیں دیں یا اس سے کم دی ہیں، اس بنا پر خاندانی نظام میں مرد ہی قوام ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اور عورت فطرتاً ایسی بنائی گئی ہے کہ اسے خاندانی زندگی میں مرد کی حفاظت وخبر گیری کے تحت رہنا چاہیے۔[۱۵]

مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے قوامیت کی دو دلیلیں دی ہیں۔اول یہ کہ محافظت و مدافعت کی جو صلاحیت یا کمانے یا ہاتھ پاؤں مارنے کی جو استعداد وہمت مرد کے اندر ہے وہ عورت کے اندر نہیں ہے دوسرے یہ کہ مرد عورت پر اپنا مال خرچ کرتا ہے۔وہ تحریر فرماتے ہیں:

''مرد کو قوامیت کے منصب پر سرفراز کرنے کے بعد نیک بیویوں کا رویہ بتایا کہ وہ نہایت فرمانبرداری کے ساتھ اپنے قوام کی اطاعت کرتی، اس کے رازوں اور اس کی عزت وناموس کی حفاظت کرتی ہیں۔اس سے آپ سے آپ یہ بات نکلی ہے کہ جو عورتیں اس کے بالکل برعکس آج اس بات کے لیے زور لگا رہی ہیں کہ وہ عورت بن کر نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں مرد بن کر رہیں گی وہ صالحات نہیں بلکہ فاسقات ہیں اور انھوں نے اس نظام کو

بالکل تلپٹ کر دینا چاہا ہے جس پر عائلی زندگی کی تمام برکتوں اور خوشحالیوں کا انحصار ہے۔''[۱۶]

خاندان کی سربراہی

اس آیت کے ضمن میں سید محمد قطبؒ نے اپنی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' میں بحث کی ہے ۔طوالت کے خوف سے ہم اسے یہاں زیر بحث نہیں لا رہے ہیں البتہ انھوں نے اپنی کتاب میں خاندان کی سربراہی کے ضمن میں نئے اسلوب سے اپنی بات ثابت کی ہے ۔اپنے مضمون کی مناسبت سے ان کے چند جملے یہاں نقل کیے دیتے ہیں:

''جہاں تک خاندان کی سربراہی کا تعلق ہے تو اس کی نوعیت ایسی ہے کہ اس سے صرف وہی فرد عہدہ برآ ہوسکتا ہے جس میں انتظامی صلاحیت ہو اور جو خاندان کے معاملات میں نگرانی اور انتظام کرسکتا ہو۔ ہمارا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ جہاں دو سربراہ ہوں وہاں سرے سے کوئی سربراہ نہ ہونے کی حالت سے بھی زیادہ انتشار اور مصائب جنم لیتے ہیں۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (الانبیاء:۲۱) زمین یا آسمان میں اگر اللہ تعالیٰ کے سوا اور معبود ہوتا تو (زمین آسمان) دونوں درہم برہم ہوجاتے۔...خود عورت بھی کسی ایسے مرد کو پسند نہیں کرتی جو کمزور ہو اور وہ اس کو بآسانی دبالے۔ایسے مرد سے وہ نفرت کرتی ہے اور کبھی اس پر اعتماد نہیں کرتی...امریکی عورت مرد کے مضبوط جسم اور کشادہ سینے کو دیکھ کر متاثر ہوتی ہے اور جب جسمانی قوت کے معاملے میں اسے اپنے سے کہیں زیادہ مضبوط اور قوی پاتی ہے تو اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتی ہے''۔[۱۷]

قرآن مجید کی دو آیتوں: لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرہ:۲۲۸) اور بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ (النساء:۳۴) کو مرد و عورت کے دائروں کی تعیین کے تعلق سے اساسی حیثیت حاصل ہے۔سید ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے:

''اسلام، عورت اور مرد میں حیاتیات اور نفسیات کے اعتبار سے جو فرق ہے اس کو بعینہٖ قبول کرتا ہے، جتنا فرق ہے اسے جوں کا توں برقرار رکھتا ہے اور جیسا فرق ہے اس کے لحاظ سے ان کے مراتب اور وظائف مقرر کرتا ہے۔ اس ضمن میں اسلام نے تین باتوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ اول یہ کہ مرد اپنے حاکمانہ اختیار کے ذریعہ اہل خاندان پر مظالم نہ ڈھائے۔ دوم یہ کہ عورت کو ایسے تمام مواقع فراہم کیے جائیں جن سے فائدہ اٹھا کر وہ ترقی کر سکے اور تعمیرِ تمدن میں اپنی حصہ داری ادا کر سکے۔ اور سوم یہ کہ عورت اپنے حقوق کا استعمال عورت رہتے ہوئے کرے۔ مردانہ پوزیشن اختیار کرنے کی صورت میں وہ تمدن کی تخریب کا باعث ہوتی ہے۔''[۱۸]

وہ مزید لکھتے ہیں:

''اسلام نے مذکورہ تینوں امور کی رعایت کرتے ہوئے عورت کو وسیع تمدنی، معاشی اور تعلیمی حقوق عطا کیے ہیں۔ اسلام کے سوا تمام قوانین نے عورت کی معاشی حیثیت کو کمزور کیا ہے۔ اسلام عورت کو وراثت کے وسیع حقوق دیتا ہے۔ باپ سے شوہر سے، اولاد سے اور دوسرے قریبی رشتہ داروں سے اس کو وارثت ملتی ہے۔ وراثت میں مرد کے مقابلہ میں نصف ملنے کی وجہ یہ ہے کہ عورت کو نفقہ اور مہر کے حقوق حاصل ہیں جن سے مرد محروم ہے۔ عورت کا نفقہ صرف شوہر ہی پر واجب نہیں ہے بلکہ شوہر نہ ہونے کی صورت میں باپ، بھائی یا دوسرے اولیاء کی کفالت میں آتی ہے۔ چنانچہ جب عورت پر وہ ذمہ داریاں نہیں جو مرد پر ہیں تو وراثت میں اس کا حصہ بھی وہ نہ ہونا چاہیے جو مرد کا ہے۔''[۱۹]

عورت کے تمدنی حقوق و مسائل

اپنے موضوع کے اعتبار سے ہم تمدنی میدان میں عورت کے حقوق کی وضاحت کریں گے۔

یہ وضاحت قرآن کے تصور صنفی مساوات کی تفہیم نو اور عصر حاضر میں پیدا ہونے والی صورت حال کو سمجھنے میں معاون ہوگی۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ بیسویں اور اکیسویں صدی میں آزادی نسواں کے زوردار نعرے لگائے گئے اور اسلامی تہذیب کو ان حقوق کے تعلق سے نہ صرف کنجوسی کا طعنہ دیا گیا بلکہ اسے ترقی کی راہ کا مانع قرار دیا۔ علماء کرام اور دانشوران نے اگرچہ اس چیلنج کا جواب دیا لیکن مسئلہ جوں کا توں مخمصے کا شکار ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا مفتی محمد شفیعؒ (۱۸۹۷-۱۹۷۶ء) کے علاوہ حالیہ برسوں میں حقوق وفرائض کے موضوعات کو سید جلال الدین عمریؒ (۱۹۳۵-۲۰۲۲ء) نے اپنی تحریروں میں خصوصی مقام دیا ہے۔ اس ضمن میں موخر الذکر کی اہم کتاب ہے: مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ۔ اس کتاب کا مطالعہ عصرِ جدید کے تناظر میں مفید ہوسکتا ہے۔

دوسری جانب عالم اسلام کے مسلم اکثریتی اور اقلیتی مقامات پر مسلم عورت کے تمدنی مسائل پر شیخ محمد یوسف القرضاویؒ (۹ر ستمبر ۱۹۲۶-۲۶ر ستمبر ۲۰۲۲ء)، عبداللہ دراز (م: ۸ر نومبر ۱۸۹۴ء)، سید قطب (۹ر اکتوبر ۱۹۰۶-۲۹ر اگست ۱۹۶۶ء) اور شیخ راشد غنوشی حفظہ اللہ (پ: ۲۲ر جون ۱۹۴۱ء) نے روشنی ڈالی ہے۔ ان علماء نے مقاصد شریعت کی روشنی میں مسئلے کو سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستان اور عالم اسلام کے علماء ودانشوران کے رجحانات وافکار کے مطالعے کے ذریعے مسئلہ زیر بحث کے تمام پہلوؤں پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ شیخ ابوشقہ کی کتاب **المرأة فی عصر الرسالہ** (پانچ جلدیں) کی تلخیص میں ایک جلد ڈاکٹر احمد کبیسی نے کی ہے جس کا اردو ترجمہ شعبہ حسنین ندوی نے کیا اور جو المعہد العالمی للفکر الاسلامی امریکہ سے شائع ہوئی۔ کتاب کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ صحیحین کی احادیث کی روشنی میں خواتین کی سماجی شرکت وخدمت اور مردوں کے درمیان اشتراک وتعاون پر کلام کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقیؒ کی کتاب: ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خواتین-ایک سماجی مطالعہ'' کا مطالعہ مفید مطلب ہوگا۔[۲۰]

خاتون کی سیاسی قیادت

عورت کے تمدنی حقوق اور مسائل کی طویل فہرست میں سے یہاں صرف دو مسائل پر گفتگو کی جائے گی، جن کی اہمیت عصر حاضر میں مختلف پہلوؤں سے دوچند ہوگئی ہے۔ عورت کی سربراہی کا مسئلہ اور

عورت کا سماجی کردار۔ ان دونوں مسائل پر فقہاء کرام نے ماضی میں انفرادی طور پر غور وفکر کیا ہے اور اجتماعی شریعہ کونسل اور فقہ اکیڈمیوں میں بھی بحث ومباحثہ جاری ہیں۔ قدیم فقہ اسلامی کے لٹریچر کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت کی حکمرانی اسلامی مملکت کے لیے جائز نہیں ہے البتہ گزشتہ برسوں میں دیئے گئے بعض فتاویٰ میں ماضی کے مقابلہ میں ایک لچک اور تبدیلی کی فضا پائی جاتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں مقابل مرد خود اسلامی تہذیب وثقافت کے لیے خطرہ ہو وہاں عورت کی سربراہی کو قبول کیا جائے گا۔ اس کی واضح مثال ۱۹۶۲ء میں پاکستان میں ایوب خاں کے مقابلہ میں صدارتی انتخاب لڑنے کے لیے علماء کی ایک معتد بہ جماعت نے فاطمہ جناح کو چنا جن کی کامیابی کے امکانات تھے۔ ان علماء میں دیوبندی مکتبِ فکر کے اکابر میں مولانا مفتی محمد شفیع اور دوسرے مکاتب فکر کے ممتاز علماء شامل تھے۔[۲۱] مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس مسئلے پر دوٹوک بات کہی تھی:

> ''مجھے یقین ہے کہ اگر اس انتخاب میں فاطمہ جناح کی تائید نہ کی گئی تو یہ آمریت پھر مسلط ہو جائے گی۔ اس کا مسلط ہونا میرے نزدیک عورت کو سربراہ بنانے کی بہ نسبت کم از کم دس گنا زیادہ بڑا گناہ ہے۔[۲۲]

شیخ راشد غنوشی نے اپنی کتاب **المرأة بين القران وواقع المسلمين**[۲۳] میں اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ عورت کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے کیوں کہ شریعت اسے ایسا کرنے سے نہیں روکتی ہے، ان مناصب میں صدر مملکت کا عہدہ بھی شامل ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر عبداللہ دراز، سید قطب، شیخ محمد الغزالی اور شیخ یوسف القرضاوی وغیرہ کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں[۲۴]

یہ چند مثالیں اس لیے پیش کی گئی ہیں تاکہ مسئلہ زیر بحث کی تفہیم میں آسانی ہو۔ بلاشبہ عورت کی سربراہی کا مسئلہ مزید ریاض چاہتا ہے البتہ اتنا تو طے ہے کہ اس ضمن میں کوئی عمومی موقف اختیار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

عورت کا سماجی کردار

دوسرا مسئلہ عورت کے سماجی کردار کا ہے۔ یہ بھی صدیوں سے غور وفکر کا مسئلہ بنا ہوا ہے اور دنیا کے مختلف ممالک میں اس کے کردار پر غور وفکر کا سلسلہ جاری ہے۔ مثلاً ہندوستان میں ذات پات کے

نظام، ستی کا رواج، شوہر کی بے چوں چرا قوامیت کو قبول کرنا وغیرہ نے یہاں کی معاشرت میں ان آزادیوں کے لیے وہ جگہ نہیں چھوڑی ہے جو عہد نبوی میں خواتین کی آزادی کے ضمن میں نظر آتی ہے۔ مثلاً ان اثرات کا یہ اثر ہوا کہ مسلمان عورت مردوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتی۔ عورت مسجد میں نہیں جا سکتی وغیرہ۔ پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقیؒ نے اپنی رجحان ساز تصنیف ''مقاصد شریعت'' میں اس موضوع کی حساسیت پر غور وفکر کی دعوت دی ہے۔ ان کی فکر کا خلاصہ یہ ہے کہ نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ کے بعد اور مسلمان ملکوں کی آزادی کی وجہ سے ان ممالک میں صدیوں سے رائج عرف وعادت کو بدلنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ عورتوں میں خواندگی بڑھی، ملکوں کا نظم وانصرام اہل ملک (مسلمان) کے ہاتھ میں آیا، مجالس قانون ساز کی وہ رکن بنیں اور ان میں عورتوں کی نمائندگی کا مسئلہ سامنے آیا۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی طرح مسلمان ممالک میں بھی عورتیں بیداری عمل میں حصہ لینے لگیں۔ اسکول، کالج، یونیورسٹی اور صحت عامہ کے دائروں میں عورتوں کے ذاتی پریکٹس، ملازمت، یا شراکت داری کے کاموں کے وسیع امکانات سامنے آئے۔ نئے عوامل پر روشنی ڈالتے ہوئے موصوف عرض کرتے ہیں کہ مغربی ممالک میں قابل لحاظ تعداد اپنے ساتھ عرف وعادت کے ساتھ نمودار ہوئی، خود ان مغربی ممالک میں پروان چڑھنے والے عناصر کے اپنے عرف وعادت تھے۔ لباس، وضع قطع، کھانے پینے کے آداب، ان تمام امور پر شریعت کے مقاصد کی روشنی میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے جن علماء کی رائے کو اہمیت دی ہے ان میں شیخ راشد غنوشی ہیں جنھوں نے اس مسئلے کو مقاصد اسلام کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔[۲۷]

خلاصہ بحث

سطورِ بالا میں صنفی مساوات کا قرآنی بیانیہ چند مفسرین وماہرین قرآنیات کی آراء کی روشنی میں واضح کیا گیا۔ اور انوثث/نسائیت سے متعلق چند منتخب آیات کی روشنی میں مسئلہ زیر بحث کا احاطہ کیا گیا۔ اس مطالعے کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ مغرب نے عورت کو مارکیٹ کے ایک پروڈکٹ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اور عورت کی حیا کی نیلامی اور حیا باختگی کے نتیجے میں انسانی تہذیب اخلاق کی پستی میں جہاں تک گر چکی ہے، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ مغربی تہذیب

نے اس کا سرے سے نوٹس ہی نہیں لیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ معاشرے کا اہم ستون خاندانی نظام، کس قدر متاثر ہوا، نام نہاد روشن خیالوں کے لیے غور وفکر کا عنوان آج تک نہیں بن سکا۔ حیرت ہے کہ مغربی تہذیب کے وکلاء: مستشرقین ومستغربین بجائے اس کے کہ تلافی مافات کرتے انھوں نے اسلاموفوبیا کو بڑھاوا دینے کی خاطر Feminism کا چراغ روشن کیا۔ مغربی اداروں کے ''تعلیم یافتہ مسلمان'' بھی عورتوں کے حقوق وفرائض اوران کے مسائل کے ضمن میں اسلام کے احکام پر معترض نظر آنے لگے۔ یہ سلسلہ گزشتہ صدی میں زور وشور سے اٹھایا گیا تاہم موجودہ صدی میں بھی اعتراضات کی یورش ہلکی نہیں ہوئی ہے۔ سیرت وقرآن سے نفرت کے ضمن میں اسلاموفوبیا کے عفریت نے عورت کے حقوق وفرائض کے تعلق سے دنیا کے سامنے ایک خوفناک تصور پیش کی۔ راقم نے اپنے اس مقالے میں اسی سنگین صورت حال کا منصفانہ جائزہ لینے کی دعوت دی ہے۔ اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ قدیم فقہ وفتاوی میں محفوظ ذخیرے کو بھی از سر نو کھنگالنے کی ضرورت ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ احکامِ اسلام کے ارتقاء میں حالات وزمانہ کی رعایت کا خیال اگر نہیں کیا گیا تو ہندوستان ہی نہیں مغربی ممالک میں ''مہاجرین'' اور خود وہاں پروان چڑھنے والی امت مسلمہ کو علمی طور پر مطمئن کرنا مشکل ہوجائے گا۔ اس ضمن میں حالیہ برسوں میں ''مقاصد شریعت'' کے موضوع پر پروفیسر نجات اللہ صدیقی کی آراء سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر موصوف کو ہندوستان، عالم عرب اور مغربی ممالک کو قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ انھوں نے عالم انسانیت کے مسائل کو حل کرنے کے لیے امت مسلمہ کے دانش وروں کے سامنے مسئلے کا ایک حل پیش کیا ہے جس میں بلاشبہ اختلاف کی گنجائش سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی آراء پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں یہ ذکر بے جا نہیں کہ ملکی وعالمی، سماجی ومعاشرتی اور تہذیبی احوال کا مجتہدانہ جائزہ لیتے وقت مولانا تقی امینیؒ کی کتاب ''احکام اسلام کے ارتقاء میں حالات وزمانہ کی رعایت کا مطالعہ بھی محققین کے لیے مفید ہوگا۔

حواشی وتعلیقات

۱۔ پردہ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (نئی دہلی) جون ۲۰۱۷ء، ص: ۱۷۶-۱۷۷

۲۔ مصر کی اسلامی تحریک اخوان المسلمون کے عظیم مفکر نے اپنی تحریروں کے ذریعہ عالم عرب میں مغربی تہذیب کے

خلاف ایک فکری انقلاب پیدا کیا۔ انھوں نے عیسائیت اور یہودیت کے مقابلہ میں اسلام کو ایک نظام کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ ان کی تحریروں میں قدیم وجدید کا حوالہ ہے اور مستقبل کے تعلق سے ایک امید نظر آتی ہے۔ موصوف نے پورے قرآن کی عربی تفسیر فی ظلال القرآن کے نام سے کی جسے پوری دنیا میں قبول عام حاصل ہوا۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا سید حامد علی (۱۹۲۳-۱۹۹۳ء) اور ان کے انتقال کے بعد مولانا مسیح الزماں لاری فلاحی ندوی نے کیا ہے۔ جو کریسنٹ پبلی کیشنز، نئی دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔ اسلام اور جدید ذہن کے شبہات کا اردو ترجمہ محمد سلیم کیانی نے کیا ہے۔ مارچ ۲۰۱۲ء تک مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (نئی دہلی) سے اس کی چھ اشاعتیں نکل چکی ہیں۔ اس کے انگریزی قالب کا ٹائٹل ہے: Islam- The Misunderstood Religion، مرکزی مکتبہ (نئی دہلی) سے مارچ ۲۰۱۱ء میں شائع ہونے والی اس انگریزی کتاب پر مترجم کا نام درج نہیں ہے، اگر درج ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔

۳۔ مترجم محمد سلیم کیانی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (نئی دہلی) مارچ ۲۰۱۲، ص: ۱۶۸، سید قطب نے اپنی کتاب "**الانسان بین المادیة و الاسلام**" میں اسی موضوع پر مفصل بحث کی ہے۔ یہاں اس کتاب کے ذیلی عنوانات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ محققین اس کا مطالعہ کر سکیں۔

(۱) وظائف اور مقاصد کا اختلاف، (۲) طبعی اور نفسیاتی فرق، (۳) عورت کا مزاج، (۴) مرد کا وظیفہ حیات، (۵) مرد کا نفسیاتی مزاج، (۶) کامیاب مرد-کامیاب عورت، (۷) صنفوں کا نقطۂ اشتراک۔ تفصیل کے لیے رجوع کریں: اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، ایضاً، ص: ۱۶۸-۱۸۷۳

۴۔ پردہ، ایضاً، ص: ۹۹-۱۰۰

۵۔ پردہ، ایضاً، ص: ۱۵۱-۱۵۲

۶۔ تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور (پاکستان) دسمبر ۱۹۸۹ء، ج ۶، ص: ۴۲۴-۴۲۵

۷۔ بیان القرآن، تاج کمپنی، نئی دہلی، جولائی ۲۰۱۵ء، ج: ہشتم، ص: ۳۶، ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنے دروس قرآن میں عورت کے تصور آزادی پر متعدد مواقع پر عصر جدید کا تناظر واضح کیا ہے ملاحظہ کریں ویب سائٹ:

1. Feminism & gender equality
2. Women's day/Women's rights in Islam
3. Women equality & rights in Islam
4. Men and women are equal but different
5. Aurat ki awaz ka parda.
6. Islam men awrat ka maqam

۸۔ پردہ، ایضاً، ص: ۱۵۳-۱۵۴

۹۔ ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن، تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی، **المملکة العربیة السعودیة**، ص: ۵۹۰

۱۰۔ تدبر قرآن، البقرہ ذیل آیت: ۲۲۳، ج: ۱، ص: ۵۲۷-۵۲۸

۱۱۔ تفسیر ماجدی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام (لکھنؤ) ستمبر ۲۰۱۶ء، ج ۱، ص: ۴۳۸، البقرہ آیت: ۲۲۳، حاشیہ: ۸۳۱

۱۲۔ پردہ، ص: ۱۵۶-۱۵۷

۱۳۔ تدبر قرآن، ج: ۱، ص: ۲۵۶-۲۵۸، البقرہ: ۱۸۷

۱۴۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس موضوع پر اپنی دوسری کتاب ''حقوق الزوجین'' میں اس مسئلے کی مزید وضاحت کی ہے، قارئین اس کا مطالعہ ضرور کریں۔

۱۵۔ تفہیم القرآن، ج: ۱، ص: ۳۴۹

۱۶۔ تدبرِ قرآن، ج ۱، ص: ۲۹۲، اس موضوع پر مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی کتاب ''اسلامی معاشرہ میں عورت کا نظام'' میں تفصیلی بحث کی ہے۔ قارئین اس کے متعلقہ ابواب کا مطالعہ کریں۔

۱۷۔ اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، ایضاً، ص: ۱۷۷-۱۷۸

۱۸۔ پردہ، ص: ۱۷۲ ملخصاً

۱۹۔ پردہ، ص: ۱۷۳، اسلام میں صنفی مساوات کے اثبات کے لیے درج ذیل آیات کا مطالعہ مفید ہوگا۔ النساء: ۳۲، ۱۲۴، غافر: ۴۰

۲۰۔ اسلامک بک فاؤنڈیشن (نئی دہلی) ۲۰۰۶ء، مزید دیکھیں مقالہ راقم: عہد رسالت میں معاشرتِ نسواں: شیخ ابوعبدالرحمٰن عبدالحلیم ابوشقہ کی آراء کا تجزیاتی مطالعہ، مجلّہ علوم اسلامیہ، ۲۰۱۷ء-۲۰۱۸ء، جلد ۳۴، ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ص: ۲۰۴-۲۲۶

۲۱۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: ڈاکٹر عبدالحق انصاری، پاکستان کا صدارتی انتخاب اور عورت کی سربراہی کا مسئلہ، رسالہ ماہنامہ زندگی (رامپور) ذوالحجہ ۱۳۸۴ھ، مطابق اپریل ۱۹۶۵ء، صفحات ۴۶ تا ۵۹

۲۲۔ خط بنام امین الحسن رضوی، ۱۶ر دسمبر ۱۹۶۴ء، مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرتبہ عاصم نعمانی، اسلامک پبلشرز (لاہور) ۱۹۸۳ء، صفحات: ۱۹-۲۰

۲۳۔ **المرأة بين القران وواقع المسلمين**، ۲۰۰۵ء دمشق، جدہ، **مركز الراية للتنمية الفكرية**، صفحات: ۱۹۱ تا ۲۱۶

۲۴۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: مقاصد شریعت، پروفیسر نجات اللہ صدیقی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (نئی دہلی) مئی ۲۰۰۹ء، ص: ۱۹۲

۲۵۔ **مركز الراية للتنمية الفكرية**، محولہ بالا، ص: ۲۰۶، بحوالہ مقاصد شریعت، محولہ بالا، مئی ۲۰۰۹ء، ص: ۲۰۳

فضل الرحمن اصلاحی *

اردو تفاسیر کا تقابلی جائزہ

قرآن مجید سے شغف اور گہری وابستگی اسی وقت ممکن ہے، جب قرآنی علوم میں مہارت پیدا کی جائے، اور قرآن مجید کے ساتھ ان کی تفسیروں کا، بالخصوص ان تفسیروں کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیا جائے، جو عصری اسلوب میں لکھی گئی ہیں اور "**خذ ما صفا و دع ما کدر**" جیسے اصول کو مدنظر رکھ کر تجزیہ کیا جائے اور اس کے بعد خاطر خواہ ان تفسیروں سے استفادہ کیا جائے، تو اس طرح ان پر ناقدانہ نگاہ بھی ہو جائے گی، اور ان کے مطالعہ کا کسی نہ کسی درجے میں حق بھی ادا ہو جائے گا۔ راقم الحروف نے اسی جذبہ کے تحت عصری تقاضوں سے ہم آہنگ اور عصری اسلوب میں لکھی گئیں پانچ اہم تفسیروں کا انتخاب کیا ہے اور درج ذیل عنوان کے تحت ''ان اردو تفاسیر کا تقابلی جائزہ'' یہ مضمون قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ امید کہ اہل علم و دانش کو یہ طالب علمانہ تجزیہ پسند آئے گا۔ یہ پانچ اہم تفسیریں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ احسن البیان، مولانا محمد جوناگڑھیؒ، حواشی و تحقیق مولانا صلاح الدین یوسفؒ

۲۔ تفسیر دعوۃ القرآن، مولانا شمس پیرزادہؒ

* معاون رفیق دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ای میل:islahi1980@gmail.com

۳۔ تذکیرالقرآن، مولانا وحیدالدین خاں
۴۔ تفہیم القرآن، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۵۔ تدبر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحیؒ

تفسیر احسن البیان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر امت کے نام جو منشور ہدایت جاری کیا تھا، اس میں یہ اہم ترین منشور بھی تھا، "**تـرکـت فیـکم امرین ما ان تمسکتم بهما لن تضلوا کتاب الله و سنتی.**"[1]

مندرجہ بالا ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اے لوگو! میں نے تم لوگوں کے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں، اگر ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہیں ہو سکتے، ایک کتاب اللہ اور دوسری میری سنت ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم کی زبان عربی ہے، لیکن دنیا میں ایک بڑی تعداد اس سے ناواقف ہے، اس وجہ سے اس کتاب ہدایت کے ترجمے ایک ناگزیر ضرورت بن گئے۔ آج اردو زبان میں دوسری زبان کے مقابلے میں قرآن کریم کے بے شمار تراجم موجود ہیں، ان میں ترجمہ مولانا جونا گڑھی ایک معروف و مشہور ترجمۂ قرآن ہے۔

ترجمۂ قرآن پر ایک نظر

چند تراجم قرآن جو زیادہ متداول و معروف ہیں، ان میں ایک نمایاں ترجمہ معروف عالم دین مولانا محمد جونا گڑھی کا ہے۔ اس ترجمہ کے متعلق علماء ہند کی اہم قرآنی خدمات کے مقالہ میں مولانا محمد وصی الرحمٰن قاسمی لکھتے ہیں:

> "یہ ترجمہ شروع میں تفسیر ابن کثیر کے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہوا تھا، اس ترجمہ کی طباعت پہلی مرتبہ ۱۳۴۷ھ میں عمل میں آئی تھی۔"[2]

زبان و بیان کے اعتبار سے یہ ترجمہ عام فہم، سلیس اور رواں ہے۔ اس ترجمہ کی ایک خاص

صفت یہ ہے کہ اس میں الفاظِ قرآن کی رعایت کی گئی ہے۔ذیل میں اس کے ترجمہ کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

تسمیہ کا ترجمہ: شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

ترجمہ سورۃ فاتحہ: سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے، بدلے کے دن یعنی (قیامت) کا مالک ہے۔ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

ترجمہ سورہ توحید (اخلاص): آپ کہہ دیجیے کہ وہ اللہ تعالیٰ ایک ہی ہے، اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے، نہ اس سے کوئی پیدا ہوا، نہ وہ کسی سے پیدا ہوا، اور نہ کوئی اس کا ہم سر ہے۔

مندرجہ بالا مثالیں اس کے اسلوب اور انداز کو پرکھنے کے لیے کافی ہیں۔

اسی طرح اس تفسیر کا ایک عمدہ تعارف (ط-ا) نے کرایا ہے جو انٹرنیٹ پر بھی موجود ہے:

> ''امت مسلمہ کی ذلت ورسوائی کا ایک بڑا سبب تصریح حدیث وقرآن کریم سے منہ موڑنا ہے۔اگر کچھ لوگ قرآن پڑھتے بھی ہیں تو اس کے معانی ومفاہیم سے بے خبر ہیں۔ضرورت ہے کہ ہر مسلمان خدا کی آخری کتاب کو سمجھنے کی کوشش کرے۔اس کے لیے کسی ایسی مختصر تفسیر کی ضرورت تھی جس کا مطالعہ آسان ہو اور اس کی عبارت عام فہم ہو۔اس ضرورت کو تفسیر ''احسن البیان'' نے بہ خوبی پورا کیا ہے۔یہ معروف عالم دین جناب حافظ صلاح الدین یوسف (رحمۃ اللہ علیہ) کی تفسیر ہے۔جس میں منہج سلف کے مطابق قرآنی مطالب کی تشریح کی گئی ہے۔اس بنا پر سعودی حکومت اسے شائع کر کے حجاج میں مفت تقسیم کرتی ہے۔''[۳]

تفسیر احسن البیان کے علاوہ حافظ صلاح الدین یوسف (متوفی ۱۲ جولائی ۲۰۲۰ء) بمقام لاہور کی اور بھی گراں قدر کتابیں ہیں۔مثلاً تفسیر سعدی (ترجمہ اردو)، دلیل الطالبین (اردو ترجمہ)، فوائد ریاض الصالحین للنووی، خلافت وملوکیت: تاریخی وشرعی حیثیت، توحید وشرک کی حقیقت، نماز محمدیؐ اور نفاذ شریعت کیوں اور کیسے؟[۴]

تفسیر احسن البیان کے مفسر کا مرثیہ قاری تاج محمد شاکر (تیوکی) نے لکھا ہے جس میں ان کے اوراق زندگی کی دل کش تصویر کی گئی ہے۔ اس معروف مرثیہ کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

صلاح الدین یوسف کو خدا نے یہ شان دیا ہے
محقق اور مفصّل احسن البیان دیا ہے
محدث اور مفسر صاحبِ قلم وقرطاس
مسلکِ حق کو ایسا رب ترجمان دیا ہے [۵]

اس تفسیر کا ایک مختصر اور جامع تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:

''یہ مختصر تفسیر بلکہ تفسیری حواشی ہیں، یہ تفسیر مولانا محمد جونا گڑھی کے ترجمہ کے ساتھ مجمع الملک فہد، مدینہ منورہ سے نیز برصغیر کے مختلف کتب خانوں سے بڑی تعداد میں شائع ہو رہی ہے اور عوام وخواص تک پہنچ رہی ہے۔ یہ تفسیری حواشی مشہور اہل حدیث عالم حافظ صلاح الدین یوسف (لاہور) کے ہیں، جو ان کی گیارہ ماہ کی سخت محنت کا نتیجہ ہے۔'' [۵]

تفسیر احسن البیان کے مآخذ

اس تفسیر کے لکھنے میں جن اہم مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

تفسیر ابن کثیر
فتح القدیر
ایسر التفاسیر
تفسیر طبری

احسن البیان کا مقدمہ

تفسیر احسن البیان پر دو زبان یعنی عربی اور اردو میں مقدمہ لکھا گیا ہے۔ یہ مقدمہ معالی الشیخ صالح بن عبدالعزیز بن محمد آل الشیخ وزیر اسلامی امور اوقاف اور دعوت وارشاد کے قلم سے ہے۔ اس میں

شیخ صالح صاحب نے حمد وثنا کے بعد خادم الحرمین شریفین شاہ فہد مرحوم کی خدمات جلیلہ کا اعتراف کیا ہے کہ کس طرح دنیا کی زندہ زبان میں ترجمہ قرآن کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا گیا اور اس کی تقسیم کے لیے کس قدر اہتمام اور خاص توجہ اس عظیم کام پر کی گئی ہے۔ چنانچہ تفسیر احسن البیان بھی اردو قارئین کے لیے سعودی حکومت نے اس کی اشاعت کے لیے خصوصی توجہ مبذول کی۔ جیسا کہ مقدمہ میں ہے:

''خادم الحرمین الشریفین کی ان ہی ہدایات اور وزارت برائے اسلامی امور کے اسی احساس کے پیش نظر **مجمع الملک فهد لطباعة المصحف الشريف بالمدينة المنورة**، اردو داں قارئین کے استفادہ کے لیے قرآن مجید کا یہ اردو ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔''

احسن البیان کی چند نمایاں خصوصیات

یہ تفسیر عوام وخواص دونوں کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہے، اس میں دعوتی اور تذکیری پہلو کی رعایت کی گئی ہے۔ اس میں تفسیری حواشی عام طور سے جامع اور مختصر ہیں۔ مثلاً سورہ کہف آیت: ۹۳ "**لا يكادون يفقهون قولا**" پر حاشیہ ان الفاظ میں موجود ہے:

''یعنی اپنی زبان کے سوا کسی اور کی زبان نہیں سمجھتی تھی''

ایسے ہی اسی سورہ میں آیت: ۹۵ کا حاشیہ اس طرح لکھا گیا ہے:

''ذوالقرنین سے یہ خطاب یا تو کسی ترجمان کے ذریعہ ہوا ہوگا، یا اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو جو خصوصی اسباب ووسائل مہیا فرمائے تھے، ان کی وجہ سے انہیں مختلف زبانوں کا علم ہوسکتا ہے اور یوں یہ خطاب براہ راست بھی ہوسکتا ہے۔''

ایسے ہی بعض حواشی قدرے طویل بھی ہیں لیکن آسان اور قابل فہم ہیں۔ مثلاً نفاثات اور قلم وغیرہ پر ہیں۔

نفاثات مؤنث کا صیغہ ہے جو النفوس (موصوف محذوف) کی صفت ہے، من شر النفوس

النفاثات یعنی گرہوں میں پھونکنے والے نفوسوں کی برائی سے پناہ۔اس سے مراد کالا جادو کا عمل کرنے والے مرد اور عورت دونوں ہیں۔یعنی اس میں جادوگروں کی شرارت سے پناہ مانگی گئی ہے۔جادوگر پڑھ پڑھ کر پھونک مارتے ہیں اور گرہ لگاتے جاتے ہیں۔عام طور پر جس پر جادو کرنا ہوتا ہے اس کے بال یا کوئی چیز حاصل کر کے اس پر یہ عمل کیا جاتا ہے۔

الذی علم بالقلم:قلم کے معنی ہیں قطع کرنا یا تراشنا۔قلم بھی پہلے زمانے میں تراش کر ہی بنائے جاتے تھے،اس لیے آلہ کتابت کو قلم سے تعبیر کیا۔کچھ علم تو انسان کے ذہن میں ہوتا ہے، کچھ کا اظہار زبان کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور کچھ انسان قلم سے کاغذ پر لکھ لیتا ہے۔ذہن وحافظہ میں جو ہوتا ہے، وہ انسان کے ساتھ ہی چلا جاتا ہے۔زبان سے جس کا اظہار کرتا ہے وہ بھی محفوظ نہیں رہتا۔البتہ قلم سے لکھا ہوا، اگر وہ کسی وجہ سے ضائع نہ ہو تو ہمیشہ محفوظ رہتا ہے۔اس قلم کی بدولت تمام پچھلے لوگوں کی تاریخیں اور اسلاف کا علمی ذخیرہ محفوظ ہے۔حتی کہ آسمانی کتابوں کی حفاظت کا بھی ذریعہ ہے۔اس سے قلم کی اہمیت محتاج وضاحت نہیں رہتی۔اس لیے اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اور اس کو تمام مخلوقات کی تقدیر لکھنے کا حکم دیا۔

اس تفسیر کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف راجح اقوال کو جمع کیا گیا ہے تاکہ تذکیری پہلو برقرار رہے اور عوام کو طول کلامی سے بچایا جائے جیسا کہ مولانا رضی الرحمٰن قاسمی اس کی اس خصوصیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس تفسیر کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک آیت سے متعلق متعدد تفسیری روایات کو جمع نہیں کیا گیا ہے، کہ روایات کو جمع کرنا اور اس کی ترجیح پر گفتگو کرنا فن تفسیر سے خصوصی دلچسپی رکھنے والے کے لیے تو یقیناً ایک مفید چیز ہے لیکن تذکیری پہلو سے اور عام مسلمانوں کے لیے یہ چیز اکتاہٹ کا سبب ہوتی ہے اور عام آدمی کے لیے بسا اوقات نفس مضمون کے سمجھنے میں بھی مانع بن جاتی ہے۔چنانچہ عام طور سے صرف راجح اقوال کو ذکر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور دوسری تفسیری روایات سے گریز کیا گیا ہے۔''[۶]

اس تفسیر کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اسرائیلی روایات سے اجتناب کیا گیا

ہے۔مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کو جس درخت کے پاس جانے اور اس کے پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا۔اس کا نام مشہور کر دیا گیا ہے کہ وہ گیہوں کا تھا،لیکن اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔چنانچہ سورہ بقرہ آیت ۳۵ پر یہ حاشیہ لگایا گیا ہے:

''یہ درخت کس چیز کا تھا؟ اس کی بابت قرآن وحدیث میں کوئی صراحت نہیں ہے۔اس کو گندم کا درخت مشہور کر دیا گیا ہے، جو بے اصل بات ہے۔ہمیں اس کا نام معلوم کرنے کی ضرورت ہے، نہ اس کا کوئی فائدہ ہی ہے''

اسی طرح اصحاف کہف کے بارے میں اعتدال سے کام لیا گیا ہے، کہ ان کے واقعات سے کیا عبرت حاصل ہوتی ہے نہ کہ اس کے بارے میں روایات کا طومار باندھا گیا ہے، حاشیہ ملاحظہ ہو:

''چنانچہ اس کے بعد وہ ایک غار میں جا چھپے، جب ان کے غائب ہونے کی خبر مشہور ہوئی تو تلاش کیا گیا،لیکن وہ اس طرح ناکام رہے جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں کفار مکہ غار ثور تک پہنچ جانے کے باوجود جس میں آپؐ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ موجود تھے ناکام رہے''۔

اس طرح تفسیر احسن البیان کی دیگر خصوصیات کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔اس تفسیر کا نام ''احسن البیان'' اسم بامسمیٰ کہا جاسکتا ہے۔کیوں کہ اس میں صحیح روایات و احادیث صحیحہ ہی کا التزام کیا گیا ہے۔اس کی اس خصوصیت کا ذکر بقول مولانا محمد رضی الرحمٰن قاسمی:

''عام طور سے تفسیر میں صحیح احادیث وروایات کو ذکر کیا گیا ہے، غیر صحیح روایات سے گریز کیا گیا ہے۔ممبئی سے مطبوعہ نسخہ میں احادیث کے حوالے ہیں، کتاب کا نام اور احادیث نمبر کے ذکر کرنے کا التزام کیا گیا ہے۔ممبئی سے مطبوعہ نسخہ کے اخیر میں موجودہ مضامین کے اشاریہ (index) نے اس تفسیر کی افادیت کو اور بڑھا دیا ہے اور اس سے استفادہ میں مزید سہولت پیدا ہوگئی ہے۔''[۷]

نقد وتبصرہ

اس تفسیر میں مذکورہ خصوصیات ومحاسن کے ساتھ ساتھ بعض قابل توجہ امور بھی ہیں، جن کی اصلاح کردی جائے تو تفسیر کی افادیت میں مزید اضافہ ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں یہ بات آچکی ہے کہ اس کی زبان سہل اور عام فہم ہے، لیکن اس میں بعض مقامات پر حواشی کے الفاظ مشکل اور تعبیرات عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہوگئے ہیں۔ مثلاً سورہ انعام آیت ۵ کا حاشیہ ان الفاظ میں لکھا گیا ہے:

''یعنی انذار کا فائدہ ایسے ہی لوگوں کو ہوسکتا ہے، ورنہ جو بعث بعد الموت اور حشر ونشر پر یقین نہیں رکھتے، وہ اپنے کفر وجحود پر ہی قائم رہتے ہیں۔''

اس میں بعث بعد الموت اور جحود وغیرہ کے لیے عام فہم تعبیرات کا استعمال عام لوگوں کے لیے مفید تر ہوگا۔

اسی طرح سورہ الذاریات آیت ۵۶ کا حاشیہ بھی قابل توجہ ہے:

''اس میں اللہ تعالیٰ کے اس ارادۂ شرعیہ تکلیفیہ کا اظہار ہے، جو اس کو محبوب ومطلوب ہے۔ اگر اس کا تعلق ارادۂ تکوینی سے ہوتا، پھر تو کوئی انس وجن اللہ کی عبادت واطاعت سے انحراف کی طاقت ہی نہ رکھتا۔''

اسی طرح سورہ حم السجدہ آیت ۱۰ کی تفسیر بھی عام فہم نہیں ہے، بلکہ بعض عالم کو بھی لغت کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پڑسکتی ہے۔

مولانا محمد رضی الرحمٰن قاسمی لکھتے ہیں:

''دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ بعض مقامات پر تفسیری حواشی میں اتنے اختصار سے کام لیا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے صحیح طور پر آیت کے مفہوم کو سمجھنا دشوار ہوگیا ہے۔ مثلاً سورہ نجم میں معراج سے متعلق چند آیات ہیں، ان کی تفسیر میں صرف الفاظ کی تشریح کردی گئی ہے۔ واقعۂ معراج پر اختصار سے بھی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے، جس سے عام قاری کو یقیناً ان آیات کے صحیح

مفہوم کو سمجھنے میں دشواری ہوگی۔اسی طرح بعض آیات اور احکام کی تشریح میں اس قدر اختصار سے کام لیا گیا ہے کہ آیت میں ذکر شدہ مسئلہ مکمل طور پر واضح نہیں ہوسکا ہے۔'' [۸]

راقم السطور کو بھی اس مذکورہ کمی کا احساس ہوا، ذہن میں یہ بات آئی کہ سورۃ الاسراء کی چند ابتدائی آیات کا مطالعہ کیا جائے، شاید وہاں پر واقعۂ معراج اور قرآن پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی گئی ہو لیکن وہاں بھی اختصار سے کام لیا گیا ہے حالانکہ اگر معراج کے واقعہ کو قرآن کی روشنی میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہوتی تو اس سے خاطر خواہ عام وخاص دونوں کو فائدہ پہنچتا۔اور ایسے ہی وہ لوگ جو واقعہ معراج کو کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ اس کو ایک روحانی خواب سے تعبیر کرتے ہیں، مثلاً سرسید احمد خاں مرحوم کے علاوہ آج بہت سے حاملین اس فکر کے پیدا ہوگئے ہیں۔اس کا ازالہ واقعۂ معراج کی تفصیل کے ذکر کرنے سے ہوسکتا تھا۔

ایسے ہی اس تفسیر میں ایک کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے، بعض مقامات پر احادیث کا حوالہ اصل مراجع کے علاوہ بعض کتب تفسیر وغیرہ سے دیا گیا ہے۔حالانکہ وہ احادیث معروف کتب احادیث میں موجود ہیں۔مثلاً سورہ بقرہ ۲۲۹ کی تفسیر میں یہ وضاحت کی گئی کہ اگر کوئی عورت کسی معقول عذر کے بغیر طلاق کا مطالبہ کرے گی تو جنت کی خوشبو تک سے محروم کردی جائے گی۔یہ مشہور حدیث ابوداؤد وغیرہ میں موجود ہے، لیکن یہاں پر ابن کثیر کے حوالہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔حالانکہ اصل مراجع کی طرف رجوع کرنے سے حدیث بآسانی مل سکتی تھی۔

اس موقع پر مولانا وصی الرحمٰن قاسمی کا تبصرہ مناسب معلوم ہوتا ہے:

''مجمع الملک فہد سے طبع شدہ نسخہ میں بہت سے مقامات پر حوالہ میں صرف کتب حدیث کے نام پر اکتفا کیا گیا ہے، مکمل حوالے نہیں دیے گئے ہیں، حالانکہ مقدمہ تفسیر میں اس تفسیر کی خصوصیات میں یہ جملہ مذکور ہے کہ مکمل حوالوں کا التزام کیا گیا ہے۔'' [۹]

ایسے ہی اس تفسیر میں پروف ریڈنگ پر خاص توجہ مبذول کی گئی تاکہ کوئی ادنیٰ سی غلطی راہ نہ پاسکے لیکن انسانی کوشش بہرحال انسانی ہوتی ہے۔بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ جب پروف کی تصحیح کی

جاتی ہے تو شیطان بعض مقامات پر انگلی رکھ دیتا ہے، تو وہ غلطیاں اشاعت کے بعد سجھائی دیتی ہیں، یہاں بھی شاید کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ مثلاً سورہ بنی اسرائیل آیت ۲۳ کے حاشیہ میں یہ بھی موجود ہے:

''علاوہ ازیں جوانی کے دیوانی جذبات۔'' [۱۰] حالانکہ جذبات مذکر ہے تو دیوانی کی جگہ دیوانے ہونا چاہیے تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ تفسیر مجموعی لحاظ سے خوب سے خوب تر ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں جو مثبت انداز میں بعض کمیوں کی نشاندہی کی گئی ہے اس پر توجہ مبذول کی جائے تاکہ اس کا افادہ عوام وخواص میں دوچند ہو۔

تفسیر دعوۃ القرآن

مولانا شمس پیرزادہ ایک مشہور عالم دین تھے۔ ان کا تعلق جماعت اہل حدیث سے تھا، بڑے جری اور صاف گو انسان تھے، ایک عرصے تک جماعت اسلامی ہند سے وابستہ تھے، مہاراشٹر کے امیر حلقہ کی ذمہ داری بھی بحسن وخوبی انجام دی، ان کا شمار جماعت اسلامی کے اہم ارکان میں ہوتا ہے۔ جب جماعت پر ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی نافذ کی گئی تو ان کو بھی جیل جانا پڑا۔ مولانا بعد میں جماعت اسلامی کی بعض پالیسیوں سے اختلاف کی بنا پر جماعت سے علیحدہ ہوگئے۔ رہائی کے بعد ایک ادارہ دعوۃ القرآن کے نام سے بنایا۔ اس کا اصلی مقصد دعوتی تھا، خصوصاً غیر مسلموں کے درمیان تبلیغ کرنا، جیسا کہ دعوۃ القرآن کے جلد اول کے پیش لفظ میں جناب شہاب بالاکوٹی نے اس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

''۱۹۷۵ء میں جب ایمرجنسی نافذ ہوئی تو جماعت اسلامی سے تعلق کی بنا پر موصوف کے ساتھ ہم لوگ بھی ناسک سینٹرل جیل میں نظر بند کر دیے گئے۔ جیل میں غیر مسلموں میں دعوتی کام کرنے کا موقع ملا، اس نے یہ احساس ابھارا کہ کوئی مختصر اور جامع تفسیر ایسی ہونی چاہیے جو غیر مسلموں کے ذہن کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہو۔ رہائی کے بعد اس احساس نے ادارہ ''دعوۃ القرآن'' کی داغ بیل ڈالی اور مراٹھی میں قرآن کے ترجمہ وتفسیر کا

منصوبہ بنایا گیا۔اس غرض کے لیے قرآن کے عربی متن کا اردو میں ترجمہ کرنے اور تفسیری حواشی مرتب کرنے کا کام موصوف (مولانا شمس پیرزادہ مرحوم) کے سپرد کیا گیا...اس کو دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ یہ تمام انسان کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے، جس کی افادیت مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لیے یکساں ہے۔''[۱۱]

راقم الحروف کے سامنے دعوۃ القرآن کے اولین ایڈیشن ۱۹۸۱ء ہیں۔اب تو ماشاء اللہ نئے انداز میں مکمل تفسیر شاندار گیٹ اپ اور معیاری اشاعت کے ساتھ تقریباً ہر جگہ دستیاب اور متداول ہے۔ چوں کہ یہ تفسیر دعوتی رنگ اور اسلوب میں لکھی گئی ہے، اس لیے اس کی بے پناہ مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اسے ملک کی زندہ زبانوں کے علاوہ انگریزی میں بھی منتقل کیا گیا ہے۔جیسا کہ آن لائن بھی ادارہ دعوۃ القرآن کی اہم کتابوں کے ساتھ اس تفسیر کا اشتہار و تعارف موجود ہے۔اس میں یہ صراحت موجود ہے:

''اس تفسیر کے مراٹھی، ہندی، گجراتی اور انگریزی ترجمے دستیاب ہیں۔''[۱۲]

اس کتاب کی ترتیب ایک خاص انداز سے کی گئی ہے جیسا کہ پیش لفظ میں اس کی وضاحت موجود ہے:

''اس کتاب کی طباعت میں ایک خاص نظام کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔دائیں صفحے پر عربی متن اور ترجمہ درج ہے اور اس کے بالمقابل بائیں صفحے پر تفسیری نوٹس موجود ہیں۔ اگر نوٹس کے لیے ایک صفحہ ناکافی ہوا ہے تو دوسرے صفحے پر بقیہ نوٹس دیے گئے ہیں۔اس طریقہ کو اختیار کرنے کی بنا پر کہیں کہیں صفحات خالی چھوڑ دینا پڑے ہیں، لیکن اس حسن ترتیب نے مطالعہ کرنے والے کے لیے بڑی سہولت پیدا کر دی ہے۔''[۱۳]

تفسیر دعوۃ القرآن لکھنے کا اصل مقصد

مولانا شمس پیرزادہ کے نزدیک اشاعت اسلام کے لیے قرآن مجید ہی اصل ہے اور اس کے علاوہ دوسری تمام چیزیں دعوت کے لیے ثانوی درجہ رکھتی ہیں۔اس بات پر مولانا نے قرآن سے ایک

اہم دلیل پیش کی ہے۔مولانا کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''دعوت اسلامی کی اشاعت کا بہترین اور مؤثر ترین ذریعہ قرآن مجید ہی ہے۔خود قرآن نے اپنی یہ شان "فذکر بالقرآن من یخاف وعید" ''قرآن کے ذریعہ ان لوگوں کی تذکیر کرو جو میری وعید سے ڈریں'' (سورہ ق) میں آیات کے ذریعہ نمایاں کیا ہے۔دوسری تمام چیزیں دعوت کے تعلق سے بالکل ثانوی اہمیت رکھتی ہیں۔لہٰذا ہر قسم کے تبلیغی نصاب میں اور ہر قسم کے تحریکی لٹریچر میں قرآن کو دعوت اسلامی کا مرکز ومحور ہونا چاہیے۔اور مخاطب کی جو زبان ہو اس میں قرآن کے ترجمہ کے ذریعہ دعوت پہونچانے میں اولیت دی جانی چاہیے۔امت کے اندر اس وقت شخصیت پرستی، گروہ بندی اور جماعتی عصبیتوں کا جو غلبہ ہے اس کو ختم کرنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ افراد امت میں قرآن کے ساتھ شعوری ربط اور گہری وابستگی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، ایسی وابستگی جو ان کے اندر قرآن مجید کا فہم پیدا کردے اور وہ حق وباطل میں امتیاز کرنے لگیں۔'' [۱۴]

گویا مندرجہ بالا اقتباس مولانا مرحوم کی فکر کا لب لباب ہے۔اور ان کی یہ فکر درج ذیل تحریر کی آئینہ دار معلوم ہوتی ہے:

مسلمانو! اٹھو قرآن کی دعوت کو پھیلاؤ
زمانۂ بے ایمان کو عافیت کے راز سمجھاؤ
زمانہ آج بھی قرآں ہی سے فیض پائے گا
مٹے گی ظلمتِ شب اور سورج جگمگائے گا

اس تفسیر کا عمدہ تعارف ویب سائٹ ''کتاب وسنت ڈاٹ کام'' پر ان الفاظ میں موجود ہے:

''زیر نظر تفسیر دعوۃ القرآن تفسیر بالماثور پر مشتمل ہے اور تفاسیر کی دنیا میں ایک خوش کن اضافہ ہے۔مفسر نے شب و روز کی محنت اور نہایت عرق

ریزی کے ساتھ ایک ایسی تفسیر پیش کی ہے، جس سے عوام وخواص یکساں طور پر مستفید ہوسکتے ہیں۔انہوں نے سب سے پہلے تفسیر القرآن بالقرآن کو سامنے رکھا ہے، کیوں کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں جو ایک جگہ اجمالا بیان ہوئی ہیں جب کہ دوسری جگہ اس کی تفصیل موجود ہے....مولانا موصوف نے تفسیر کرتے ہوئے ضعیف اور موضوع احادیث رقم کرنے سے گزیز کیا ہے.....تفسیر میں موجود تمام احادیث وآثار کی مکمل تخریج وتحقیق کی گئی ہے۔اس کے علاوہ سورتوں کی شانِ نزول کے ضمن میں صرف اور صرف مستند روایات کا حوالہ دیا گیا ہے۔'' [۱۵]

مولانا شمس پیرزادہ نے اپنی تفسیر کا مقدمہ مختصر اور نہایت جامع انداز میں لکھا ہے۔اور اس تفسیر میں سارے بنیادی اصول بیان کردیے گئے ہیں۔مولانا نے اپنے مقدمہ میں قدرے تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی ہے۔چنانچہ وہ رقم طراز ہیں:

''قرآن کا پیغام پہنچانے اور مسلمانوں میں دعوت وارشاد اور تبلیغ واصلاح کے میدان میں قرآن کو مرکز توجہ بنانے اور اس کے ساتھ شعوری ربط پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کی تشریح وتفسیر اس طور سے کی جائے کہ اس کی اصل دعوت سمجھنے میں قاری کو مدد ملے۔توحید، آخرت اور رسالت کے دلائل بخوبی واضح ہوں، جدید فکری گمراہی کے مقابلہ میں قرآن کی راہ ہدایت روشن ہو، قرآنی تعلیمات کے سلسلہ میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو، ربط آیات ونظم کلام اس طرح واضح ہو کہ قاری کو اس کے اندر علم وحکمت کے خزانوں کا سراغ ملے، تربیت وتزکیہ اور تعمیر سیرت کے پہلو نمایاں ہوں۔'' [۱۶]

آگے مولانا مزید وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ان تمام باتوں کا اہتمام عصر حاضر کے انسان کو قرآن سے قریب کرنے کے لیے ضروری ہے۔اگر چہ اردو میں متعدد قابل قدر تفاسیر موجود ہیں،

لیکن پھر بھی ایک مختصر اور جامع تفسیر کی ضرورت گوناگوں وجوہ سے محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً علاقائی زبانوں میں قرآن کے معانی کو منتقل کرنے کے لیے ایسی تفسیر کی ضرورت ہے جس میں مسلمانوں کے ذہن کو ہی نہیں غیر مسلمین کے ذہن کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہو اور اس مناسبت سے ضروری توضیحات پیش کی گئی ہوں۔'' [۱۷]

ترجمہ کا اسلوب و انداز

اس تفسیر میں ترجمہ کا انداز نہ تو لفظی ہے اور نہ ہی آزاد بلکہ بامحاورہ ترجمہ کیا گیا ہے۔ مولانا کے پیش نظر قرآن کریم کا ایک ایسا موزوں ترجمہ کرنا تھا جس میں الفاظ کا لحاظ بھی کیا گیا ہو۔ اس سلسلے میں مولانا کے خیالات ملاحظہ ہوں:

''ترجمہ میں اس بات کا التزام کیا ہے کہ یہ بامحاورہ ترجمہ ہو نہ کہ آزاد ترجمہ، کیوں کہ آزاد ترجمہ میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے جاتا رہتا ہے، جب کہ کلام الٰہی کے ترجمہ کے سلسلہ میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں آزاد ترجمہ میں الفاظ کی رعایت کم ہی کی جاتی ہے۔ ترجمہ گو بڑا ہی فصیح و بلیغ معلوم ہونے لگتا ہے لیکن مفہوم کی ادائیگی ترجمہ کا بدل نہیں ہوسکتی۔ کسی بھی عبارت کے ترجمہ اور مفہوم کی ادائیگی میں جو فرق ہوتا ہے وہ بہر حال برقرار رہے گا۔ رہا لفظی تو اس سے مطلوبہ مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ اس سے معنی ہی مغلق ہوکر رہ جاتے ہیں۔ ان دونوں کے بین بین ہمارے خیال میں بامحاورہ ترجمہ کا طریقہ ہی احوط وانسب ہے۔ پھر یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ قرآن کے الفاظ اتنے معنی خیز، اس کا بیان اتنا جامع، اس کا اسلوب اتنا بلیغ، اس کی ترتیب اتنی دقیق، اس کا نظم اتنا پرمغز اور اس کے ارشادات ایسی شان کے ہیں کہ اس کو کسی بھی دوسری زبان میں ٹھیک ٹھیک منتقل کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ اس لیے جو کچھ

کر سکتے ہیں وہ اس کا قریب قریب ترجمہ ہے نہ کہ عین ترجمہ۔'' [۱۸]

اس کے بعد ترجمہ کے چند نمونے مختلف مقامات سے پیش کیے جاتے ہیں، تاکہ مندرجہ بالا بیانات کی تصدیق ہوسکے۔ اولاسورۃ الفاتحہ کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ .اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْن الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم، مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْن، إِيَّاكَ نَعْبُدُ وإِيَّاكَ نَسْتَعِيْن، اهدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِيْمَ، صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنعَمتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ المَغضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلاَ الضَّالِّيْن''

''اللہ رحمٰن رحیم کے نام سے۔حمد اللہ ہی کے لیے ہے، جو تمام کائنات کا رب ہے، رحمٰن ورحیم ہے۔ روز جزا کا مالک ہے۔ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت بخش، ان لوگوں کے راستے کی جنہیں تو نے انعام سے نوازا، جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ۔''

اس کے بعد سورۃ البقرہ: ۷ کا ترجمہ پیش خدمت ہے:

''خَتَمَ اللّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عظِيْم''

''اللہ نے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔وہ عذاب عظیم کے مستحق ہیں''

اس کے بعد سورہ آل عمران آیت: ۱-۴ کا ترجمہ بھی دیکھ لیا جائے تا کہ بات اور زیادہ منقح ہوجائے:

''الم ۝ اللّهُ لا إِلَهَ إِلاَّ هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ۝ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالإِنجِيْلَ۝ مِن قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ۝ إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُواْ بِآيَاتِ اللّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۝ وَاللّهُ عَزِيْزٌ ذُو انتِقَامٍ.''

''الف، لام، میم، اللہ جس کے سوا الٰہ (خدا) نہیں، وہ زندہ ہستی ہے جو قائم ہے اور سب کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اس نے تم پر کتاب برحق نازل کی جو سابقہ کتابوں کی تصدیق کرتی ہے، اور وہ تورات وانجیل نازل کر چکا ہے، اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے، نیز اس نے فرقان اتارا۔ یقین جانو جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کریں گے ان کو سخت سزا ملے گی۔ اللہ غالب ہے اور (گناہوں کی پاداش میں) سزا دینے والا ہے۔''

محض ترجمے کے یہ نمونے اس بات پر شاہد ہیں کہ مولانا نے مندرجہ بالا سطور میں جو ترجمہ کے اصول اپنائے ہیں اس پر وہ کاربند نظر آ رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس ترجمہ میں وہ روانگی و برجستگی پیدا نہیں ہو سکتی جو دیگر تفاسیر میں ملتی ہیں، اس بنا پر مولانا کے ترجمہ میں عربیت کا غلبہ صاف جھلکتا ہے۔ مثلاً سورہ فاتحہ کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں: رحمٰن، رحیم، حمد اور مغضوب۔

ایسا مولانا نے حد درجہ احتیاط کی بنا پر کیا ہے جب کہ مندرجہ بالا سطور میں اس کے متعلق یہ خیالات گزر چکے ہیں۔ ''ان دونوں کے مابین ہمارے خیال میں بامحاورہ ترجمہ کا طریقہ ہی احوط اور مناسب ہے۔''

اب اس کے بعد حواشی پر گفتگو کی جائے گی۔ اس سے قبل اس کے تئیں مولانا کے خیالات کا جاننا مناسب ہوگا۔ چنانچہ ان کے خیالات درج ذیل ہیں:

''تفسیری حواشی مرتب کرتے ہوئے ہم نے عصرِ حاضر کے ذہن اور دعوتِ قرآنی اور تعلیمات ربانی کے سلسلے میں ابھرنے والے سوالات کو سامنے رکھا ہے، تاکہ اس کے ذہن کی تشفی کا سامان ہو، لیکن ہم نے اس بات کی پوری احتیاط برتی ہے کہ قرآن کو کسی مخصوص رنگ میں نہ پیش کیا جائے، خواہ وہ تصوف کا رنگ ہو، یا سیاست کا اور نہ کسی مخصوص نظریہ کی تائید کا اس کو ذریعہ بنایا جائے، اور نہ ہی اس کی اصطلاحات کا کوئی ایسا مفہوم بیان کیا جائے جو امت کے مسلمات کے خلاف ہو۔'' [19]

آیات متشابہات کی تفسیر بھی مولانا نے بڑے ہی محتاط انداز میں کی ہے اور جمہور مفسرین کی

آراء کا خیال کیا ہے۔اس ضمن میں ان کا نظریہ وہی ہے جو امام دارالہجرۃ مالک بن انسؒ کا ہے۔ چنانچہ مولانا کی عبارت ملاحظہ ہو:

''اسی طرح اسماء وصفات کے بارے میں سلف صالحین کے اس طریقہ کو اختیار کیا ہے جس کی نشان دہی امام مالکؒ کے بیان سے ہوتی ہے جب ان سے استواء علی العرش کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اللہ کا عرش پر مستوی ہونا معلوم ہے، اس کی کیفیت مجہول (نامعلوم) ہے، اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔'' [۲۰]

مولانا کے یہ دونوں اقتباس اس بات پر شاہد ہیں کہ ترجمہ کے ساتھ تفسیری حواشی میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے بلکہ سلف کے منہج کا پورا پورا خیال کیا ہے۔ایسے ہی تفسیر قرآن میں احادیث سے استفادہ واستنباط کے رویہ میں ان کا اپنا ایک نظریہ ہے جس پر وہ بڑی مضبوطی سے گامزن نظر آتے ہیں۔جیسا کہ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''قرآن کی تشریح کا اصل حق سنت کو ہے۔اس لیے اس کی روشنی ہی میں تفسیری نوٹ لکھے گئے ہیں۔اور موقع کی مناسبت سے کہیں کہیں احادیث نقل کردی گئی ہیں۔البتہ روایات کے معاملے میں ہم نے فیاضی کا ثبوت نہیں دیا ہے۔کیوں کہ تفسیر سے متعلق بکثرت روایات کی صحت مشتبہ ہے، نیز ایسی روایات بھی ہیں جو قرآن کے بیان سے مطابقت نہیں رکھتیں۔'' [۲۱]

اسلوب تفسیر وحواشی

ترجمہ کے بعد اب مولانا کے انداز تفسیر اور حواشی کا مطالعہ کیا جاتا ہے:

مثلاً سورۃ البقرہ میں پہلے اس کے زمانہ نزول، پس منظر اور اس کے بعد نظم کلام پر گفتگو کی گئی ہے اور سورۃ البقرہ کی فضیلت میں مسلم شریف سے مشہور حدیث بھی بطور استدلال پیش کی گئی ہے۔ وہ حدیث مع ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

"لا تجعلوا بیوتکم مقابر ان الشیطان ینفر من البیت الذی تقرأ فیه سورة البقرة". (صحیح مسلم)

اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورہ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔

اس پر مولانا نے بڑا ہی جامع حاشیہ اس انداز میں تحریر فرمایا ہے:

''شیطان کی شازشوں کو بے نقاب کیا گیا ہے اور اس میں عائلی زندگی کے احکام بھی بیان کیے گئے ہیں، نیز ایمان اور ہدایت کی راہ بخوبی واضح کی گئی ہے۔ اس لیے جس گھر میں اس کو سمجھ کر پڑھنے پڑھانے کا اہتمام کیا جائے گا، وہاں شیطان کو فتنہ اور شر برپا کرنے میں کامیابی نہیں ہو سکے گی۔'' [۲۲]

سورہ بقرہ آیت ''ہدی للمتقین'' کا حاشیہ اس انداز میں تحریر فرمایا ہے:

''قرآن کے ہدایت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب اللہ تک پہنچنے کا راستہ دکھاتی ہے۔ زندگی کی پر پیچ راہوں کے درمیان یہ کتاب راہِ سنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور عقائد وافکار ومعاملات اور فضائل واعمال کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔ اس کی روشنی میں انسان راہِ حق پر چل کر منزل مقصود کو پہنچ سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ کھلے ذہن سے اس کا مطالعہ کرے اور ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر حق بات کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔'' [۲۳]

اس انداز میں مکمل سورہ بقرہ کی تفسیر وحواشی لکھے گئے ہیں۔ البتہ مولانا پیرزادہ بھی نظم قرآن یا نظم کلام کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ سورہ بقرہ کا نظم کلام چند آیات کا مجموعہ بنا کر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یعنی جستہ جستہ آیات کا نظم پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ علامہ فراہی کے فکر کے خوشہ چیں ہیں جیسا کہ انہوں نے عربی تفاسیر سے استفادہ کے باب میں تفاسیر فراہی کا بھی ''مقدمہ دعوۃ القرآن'' میں ذکر کیا ہے۔

نظم کلام کے سلسلے میں ایک نمونہ سورۃ البقرہ کا پیش کیا جاتا ہے تاکہ مولانا کا نظریہ نظم کلام کا

مطالعہ کیا جا سکے کہ وہ اس اہم موضوع پر کیا موقف رکھتے ہیں:

''نظم کلام کے لحاظ سے سورہ کا ابتدائی حصہ آیت ۱ تا ۲۰ تمہید کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ اس ہدایت کو کس طرح کے لوگ قبول کریں گے اور کس طرح کے لوگ قبول نہیں کریں گے۔''[۲۴]

اسی طرح سورۃ الاخلاص کی تفسیر بھی مولانا نے محققانہ انداز میں لکھی ہے، اس میں بعض آسمانی کتابوں کے حوالے بھی پیش کیے گئے ہیں، مثلاً زبور اور انجیل میں متیٰ، مرقس وغیرہ۔ اس تفسیر کا انداز یہ ہے کہ پہلے بامحاورہ ترجمہ پیش کیا گیا ہے، اس کے بعد نام، زمانۂ نزول، مرکزی مضمون، نظم کلام اور اہمیت وعظمت جیسے عناوین قائم کر کے ان پر جامع گفتگو کی گئی ہے۔

پہلے ترجمہ سورہ الاخلاص ملاحظہ ہو:

''قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ اللَّهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْوَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُواً أَحَدٌ''

''کہہ دو اللہ یکتا ہے، اللہ وہ بالاتر ہستی ہے جو سب کا مرجع وملجا ہے، نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے''۔

مولانا نے اس سورہ کے مرکزی مضمون پر یوں تحریر فرمایا ہے:

''مرکزی مضمون توحید ہے اور خاص طور سے اس کا یہ پہلو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا صحیح تصور پیش کرنا تاکہ باطل تصورات کی جڑ کٹ جائے۔''

اس کے بعد نظم کلام پر مختصر اور جامع گفتگو کی ہے:

''آیت نمبر ۱ اور ۲ میں مثبت پہلو سے اللہ تعالیٰ کی صفات بیان ہوئی ہیں اور آیت نمبر تین اور چار میں منفی پہلو سے تاکہ قوموں اور ملتوں میں جن راہوں سے شرک داخل ہوا ہے وہ مسدود ہوں۔''

اس کے بعد چند حواشی سورۃ الاخلاص کے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ اندازہ کرنے میں آسانی ہو کہ مولانا نے توحید کے پہلو پر کس قدر باریک بینی سے قلم اٹھایا ہے۔ چنانچہ الصمد کا حاشیہ ملاحظہ ہو:

الصمد: متن میں لفظ الصمد استعمال ہوا ہے جس کے معنی میں بڑی وسعت ہے، اس لیے کسی

ایک لفظ میں اس کا ترجمہ کرنا مشکل ہے۔آگے چند سطروں کے بعد یہ نکتہ قابل توجہ اور لائق عمل معلوم ہوتا ہے:

''ان لغوی معنی کے پیش نظر آیت میں اللہ تعالیٰ کے لیے الصمد کی جو صفت بیان ہوئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بالاتر ہے، اس کی سیادت کامل ہے، وہی مقصود و مرجع ہے، وہی ملجا و ماویٰ ہے۔ وہ بے نیاز ہے، اسے کسی چیز کی حاجت نہیں۔ سب اس کے محتاج ہیں اور وہ سب کی حاجتوں کو پوری کرنے والا ہے۔''

مولانا نے توحید کو بعض آسمانی کتابوں کے حوالہ سے بھی ثابت کیا ہے، چند اقتباس درج ذیل ہیں۔ مثلاً تورات میں ہے:

''پس اے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے''۔ (استثناء ۲:۴)

اور زبور میں ہے:

''تو ہی واحد خدا ہے۔'' (زبور: ۸۶:۱۰)

اس کے بعد تقابل ادیان پر بڑی گہرائی سے عیسائیوں کے ''عقیدۂ تثلیث'' اور ہندوؤں کے ''عقیدہ تری مورتی'' پر تیشہ زنی کی ہے۔ مولانا کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''لیکن انبیاء علیہم السلام کی اس بنیادی تعلیم سے قوموں اور ملتوں نے انحراف کیا اور گمرہی میں پڑ گئیں، اس انحراف کی ایک مثال تو عیسائی مذہب کا عقیدۂ تثلیث ہے جو باپ، بیٹا اور روح القدس تین خداؤں کے مجموعہ کا نام ہے اور اس کی دوسری مثال ہمارے ملک کے بت پرستوں کا تری مورتی کا عقیدہ ہے جو تین دیوتاؤں برہما، وشنو اور شیو کے مجموعہ کا نام ہے۔ ان کا مذہبی نشان اوم (om) تین خداؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔''[۲۵]

آخر میں مولانا نے قرآن کی دعوت توحید کو اس درمندی کے ساتھ پیش کیا ہے:

''جو لوگ ان مشرکانہ فلسفوں میں الجھ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں، ان کی نجات اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ وہ تعصّبات کو چھوڑ کر قرآن کی روش کو

قبول کرلیں۔'' [۲۶]

اس سورہ میں علامہ اقبال کا یہ شعر بھی برمحل نقل کیا گیا ہے:

چراغِ مصطفوی سے شرار بولہبی

تفسیر دعوۃ القرآن کے مآخذ

اس تفسیر کے مآخذ میں بعض اہم عربی، انگلش اور اردو کی تفسیروں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ مقدمہ میں مولانا خود تحریر فرماتے ہیں:

''تفسیر دعوۃ القرآن کے سلسلہ میں ہم نے عربی کی مستند اور مشہور تفاسیر سے استفادہ کیا ہے، مثلاً تفسیر ابن کثیر، تفسیر رازی، احکام القرآن، سید قطب کی فی ظلال القرآن، تفسیر فراہی وغیرہ۔ نیز اردو تفاسیر میں مولانا امین احسن اصلاحی کی تدبر قرآن، مولانا مودودی کی تفہیم القرآن، انگریزی تفاسیر میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی تفسیر، عبداللہ یوسف علی کی تفسیر کے علاوہ، دیگر متعدد عربی، اردو تفاسیر وغیرہ سے مدد لی ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ ہم نے امام رازی کی تفسیر کبیر، علامہ فراہی کی تفسیر اور مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر تدبر قرآن سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ تاہم یہ واضح رہے کہ ہم نے کسی ایک تفسیر کی پابندی قبول نہیں کی ہے، بلکہ تحقیق کا طریقہ اختیار کیا ہے۔'' [۲۷]

دعوۃ القرآن کی چند نمایاں خصوصیات

ہر تفسیر کی اپنی اپنی خصوصیات ہوا کرتی ہیں۔ دعوۃ القرآن کی چند نمایاں خصوصیات کو نکات کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ یہ مختصر، جامع اور مدلل تفسیر ہے۔

۲۔ اس میں قرآن کی اصل دعوت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۳۔ عصر حاضر کی جدید فکری گمراہیوں کے مقابلہ میں تعلیمات ربانی کی دل نشیں تشریح کی گئی ہے۔

۴۔ زندگی کے جملہ مسائل میں قرآن مجید کی اصل تعلیمات کو واضح کیا گیا ہے تاکہ ہر مسئلہ میں پہلے قرآن مجید ہی کی طرف رجوع کرنے کی فضا پروان چڑھے۔

۵۔ یہ تفسیر عام انسانی ذہن کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ تاکہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لیے مفید ہو۔

۶۔ اس کا اسلوب جدید اور عصر حاضر کے ذہن کو متاثر کرنے والا ہے۔

۷۔ اس کی زبان سلیس اور عام فہم ہے۔

۸۔ اس تفسیر کا طرز استدلال عقلی اور سائنٹفک ہے۔

۹۔ اس میں نظم کلام اور ربط آیات کی توضیح کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔

۱۰۔ ضعیف اور موضوع احادیث سے مکمل پاک ہے۔

۱۱۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ صرف قرآن کی دعوت وتبلیغ کو خالص قرآنی رنگ میں پیش کرتی ہے، اور وہ کسی بھی مکتبۂ فکر کی پابندی سے آزاد و بالاتر ہے۔

اس طرح اس تفسیر کی یہ گیارہ خصوصیات ''احد عشر کوکبا'' کہلانے کی مصداق ہیں۔

نقد وتبصرہ

۱۔ دعوۃ القرآن اپنی نوعیت کی منفرد تفسیر ہے، جو اسم با مسمیٰ کہلانے کی مصداق ہے۔

۲۔ اس کے مفسر کے نزدیک ''دعوتِ اسلامی کی اشاعت کا بہترین اور مؤثر ترین ذریعہ قرآن مجید ہی ہے، خود قرآن نے اپنی یہ شان **"فذکر بالقرآن من یخاف بالوعید"** (سورہ ق ۴۵) جیسی آیات کے ذریعہ نمایاں کی ہے۔

۳۔ قرآن مجید کی متعدد دعوتی انداز کی آیات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ قرآن کے سامنے دوسری تمام اشیاء دعوت کے باب میں بالکل ثانوی اہمیت رکھتی ہیں۔

۴۔ دعوۃ القرآن تفسیر لکھنے کی ایک بڑی ضرورت پیشِ نظر یہ بھی تھی کہ آج امت کے اندر قرآنی

مضامین کو اس قدر عام کیا جائے کہ شخصیت پرستی اور جماعتی عصبیتوں کا ازالہ ہو جائے جیسا کہ مولانا نے مقدمہ میں اس بات پر زور دیا ہے۔

۵۔ اس تفسیر کے مآخذ میں عربی، اردو اور انگریزی کی اہم تفاسیر سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۶۔ اس تفسیر کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کا اشاریہ بھی اس کی افادیت کو دوچند کرتا ہے۔

۷۔ ساتھ ہی مشہور مقامات جن کا تعلق قرآن سے ہے اس کے بھی نقشہ جات دیے گئے ہیں۔

۸۔ ان کے علاوہ بعض جلدوں میں تصحیح نامہ بھی تیار کیا گیا ہے۔

۹۔ راقم الحروف کے نزدیک اس تفسیر میں بامحاورہ ترجمہ میں بعض مقامات پر عربیت کا غلبہ معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ سورہ الفاتحہ کے ترجمہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۰۔ دعوۃ القرآن میں بعض آیات کا ترجمہ کرنے سے رہ گیا ہے۔ شاید کاتب سے سہو ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ الکہف آیت ۳۰ کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے۔ (پہلا ایڈیشن ۱۹۸۷ء، ص:۹۹۶)

۱۱۔ اس طرح مجموعی لحاظ سے یہ تفسیر دعوتی نقطۂ نظر سے بے مثال تفسیر ہے۔ اور بھی بعض تفسیریں اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں جیسے تذکیر القرآن از مولانا وحید الدین خاں، اور مواعظ القرآن از مختار اصلاحی وغیرہ۔ لیکن اس تفسیر کو خالص دعوتی رنگ میں پیش کرنا، اس میں اسی کو اولیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ترجمے کئی زبانوں میں پائے جاتے ہیں جو مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لیے یکساں مفید ہیں۔

مصادر و مراجع

۱- خطبۂ حجۃ الوداع، مشکاۃ المصابیح، دیوبند، سہارنفور، ص:۹
۲- علماء ہند کی اہم قرآنی خدمات، المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد، ۲۰۱۴ء، ص:۲۲۰
۳- بذریعہ نیٹ
۴- صلاح الدین، ویکیپیڈیا
۵- حوالہ سابق
۶- علماء ہند کی اہم قرآنی خدمات، ص:۲۲۵
۷- حوالہ سابق، ص:۲۲۶

۸- حوالہ سابق، ص: ۲۲۷
۹- حوالہ سابق، ص: ۲۳۰
۱۰- حوالہ سابق، ص: ۲۳۰
۱۱۔ مولانا شمس پیرزادہ، دعوۃ القرآن، جلد اول، ادارہ دعوۃ القرآن ممبئی، ۱۹۸۱ء، ص: (ب)
۱۲۔ بذریعہ نیٹ
۱۳۔ مولانا شمس پیرزادہ، دعوۃ القرآن، جلد اول، ص: (ج)، ۱۹۸۱ء
۱۴۔ بذریعہ نیٹ (kitabosunnat.com)
۱۵۔ مولانا شمس پیرزادہ، دعوۃ القرآن، جلد اول، ص: (ہ)
۱۶۔ حوالہ سابق، ص: (ہ)
۱۷۔ حوالہ سابق، ص: (ہ)
۱۸۔ حوالہ سابق، ص: (و)
۱۹۔ حوالہ سابق، ص: (و)
۲۰۔ حوالہ سابق، ص: (و)
۲۱۔ شمس پیرزادہ، دعوۃ القرآن، جلد اول، ص: ۸-۹
۲۲۔ حوالہ سابق، ص: (۱۱-۱۲)
۲۳۔ حوالہ سابق، ص: (۸)
۲۴۔ حوالہ سابق، سورۃ الاخلاص تفسیر پارہ عم، ص: ۲۱۶، ۱۹۸۲ء
۲۵۔ حوالہ سابق، ص: ۲۱۵
۲۶۔ حوالہ سابق، ص: ۲۱۸
۲۷۔ شمس پیرزادہ، دعوۃ القرآن، جلد اول، مقدمہ تفسیر، ص: (ر)

عبیداللہ فہد فلاحی *

بدلتے حالات میں فکر اسلامی کے مسائل

(ملتان میں علمی تگ ودو)

دورِ نبوت میں انسانی وسائل

ڈاکٹر محمد شفیق انجم بہاولپور سے تقریباً دس بارہ کلومیٹر دور ایک مقام لودھرا کے رہنے والے ہیں۔ آج ۲/ دسمبر ۲۰۲۲ء کو بہاولپور پاکستان سے ملتان کے لیے روانگی اُن ہی کی شفقت اور اپنائیت کے سایے میں عمل میں آئی۔ انھیں سیرت کے نت نئے موضوعات سے دلچسپی ہے:

خواتین کی خود اختیاری عہد رسالت میں

فقہ الاقلیات کا نبوی مثالیہ

شوریٰ و جمہوریت کی تنظیم دور نبوت میں

جدید نفسیاتی الجھنیں اور اسوۂ حسنہ میں اُن کا حل

خود اُن کی پی ایچ ڈی کا موضوع ہے۔

* پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ای میل: fahad.is@amu.ac.in

''عہدِ رسالت میں انسانی وسائل کی تنظیم اور اُن کا ارتقاء'' بدقسمتی سے ابھی تک طباعت کے انتظار میں ہے۔ سیرت نگاروں نے بالعموم اس پہلو کو نظر انداز کیا ہے۔ (Human Resource Devepment) ''وسائل انسانی کا ارتقاء'' آج سماجی علوم کا انتہائی ترقی یافتہ شعبہ ہے، افرادی وسائل کی تنظیم وارتقا پر حکومتیں مستقل قلم دان تشکیل دیتی ہیں۔ اس کے لیے ایک گراں قدر بجٹ مختص کرتی ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تنظیم سیاست اور اصلاحِ تمدن کا بے مثال کارنامہ انجام دیا۔ اس میں انسانوں کی لیاقت وقابلیت کی قدر شناسی، اُن کی قابلیت کے مطابق ذمہ داریوں کی تفویض اور ان کی تعریف وتحسین، اُن کے اندر صلاحیت وصالحیت کا نشوونما؛ وہ پہلو ہیں جن کا عصری ادراک ناگزیر ہے۔

ملتان کا یہ سفر ڈاکٹر ساجد حسین بہاولپور کی محبتوں کا مرہون ہے۔ انھوں نے اپنی آرام دہ گاڑی اپنے ڈرائیور کے ساتھ اپنے معمولات کو بالائے طارق رکھ کے ہمارے حوالہ کی۔ وہ پیشہ سے ہی طبیب نہیں ہیں، روحانیت اور اخلاق کا پیکرِ عمل ہونے کی وجہ سے مریضانِ قلب کے بھی مسیحا ہیں۔ مدتوں سے اپنی رہائش گاہ پر ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد کے ماہانہ درس قرآن کا نظم کرتے آئے ہیں اور حاضرین کی تواضع اور مدارات بھی۔ اپنے بعض مذاکروں میں انھیں دلچسپی سے شرکت کرتے ہوئے دیکھا۔ اگر کبھی دوبارہ حاضری کا موقع ملا تو اُن کی قدم بوسی کو اپنی سعادت سمجھوں گا۔

بہاولپور کی علمی وفکری سوغاتوں کے علاوہ ڈاکٹر ابوبکر، ایم نقاش علی، ڈاکٹر عبدالغفار اور ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد کے قیمتی تحائف زندگی کی یادگار ہیں۔ آخر الذکر نے تو رفیق حیات کو بھی اپنی نوازشوں میں شامل کرنا ضروری تصور کیا۔ ڈاکٹر عبدالغفار خود محبتوں کے نذرانے لے کر حاضر ہوئے مگر ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد کے عطایا دیکھ کر قہقہہ بردوش لہجے میں بول ہی پڑے:

> ''آپ بہت ہوشیار اور ذکی الحسّ ہیں۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ اندرون خانہ کو مسرور کر کے آپ نے میدانِ مسابقت مار لیا ہے۔''

پاکستان میں سیکولرزم

ملتان کے پیرِ مغاں پروفیسر عبدالقدوس صہیب بہاءالدین زکریا یونیورسٹی کے شعبہ علوم میں اساتذہ کے ساتھ چائے کی میز پر منتظر تھے۔ ڈاکٹر محمد شفیق انجم کو تاکید تھی کہ وہ براہِ راست شعبہ پہنچیں۔

ساڑھے گیارہ بجے سب سے پہلے صدر شعبہ نے والد مرحوم الحاج عبارت حسین خاں، برادرانِ اصغر ڈاکٹر احسان اللہ فہد اور ڈاکٹر امان اللہ فہد کی ناگہانی وفات پر تعزیت کی اور اجتماعی طور سے دعائے مغفرت کی۔

بعض نئے اساتذہ کی موجودگی سے خوشی ہوئی۔ معلوم ہوا کہ مرکز برائے تصوف وعرفانیات کا قیام عمل میں آچکا ہے اور اس مرکز میں دو مرد اور دو خاتون اساتذہ کی تقرری ہوچکی ہے۔ ڈاکٹر عنبرین علی بھی ان نو واردان میں شامل ہیں۔ چائے کا دور ختم ہوا تو تمام اساتذہ بین الاقوامی کانفرنس کی تیاری میں لگ گئے اور میں تکان اتارنے کے لیے صدر شعبہ کے کمرے میں صوفے پر نیم دراز ہوگیا۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر عنبرین علی تشریف لائیں تو میں سیدھا بیٹھ گیا۔ انھوں نے میری حالیہ تصانیف سے دلچسپی ظاہر کی تو میں نے بعض کتابوں کے حوالے دیے:

۱۔ جبر و جمہوریت اور سید مودودیؒ، القلم پبلی کیشنز، کشمیر ۲۰۲۱ء

۲۔ تجدیدِ دین اور تجددّ، منشورات پبلشرز اینڈ دسٹری بیوٹرز، نئی دہلی ۲۰۲۲ء

۳۔ پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی (۱۹۴۴-۲۰۲۰ء) مجلّہ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی خصوصی اشاعت ۲۰۲۲ء

4. Supernaturalism of the Quran (History of the Idiology of Ijaz Al-Quran, Publications Division, AMU Aligarh 2028.
5. Miracles of the Prophets- Said Nursi's Readings in the Science Perspective, Department of Islamic Studies, 2019.
6. Caricaturing the Noble Prophet - A Study of Violence and Pluralism in Islam, Publications Division, AMU Aligarh 2019.

میں نے ڈاکٹر عنبرین علی کے دونوں بچوں عبدالسبحان اور مناہل کی خیریت دریافت کی۔ انھیں تعجب ہوا کہ بچوں کے نام تک مجھے یاد ہیں۔ اور بیٹی مناہل کو فون کر کے طلب کرلیا وہ بی اے چھٹے سمسٹر تاریخ کی طالبہ ہیں۔ اُس نے آتے ہی کئی سوالات کر ڈالے:

پاکستان کے لیے سیکولرزم کے انتخاب کی تجویز یہاں کے بعض اساتذہ، دانشور اور میڈیا کے

ماہرین دے رہے ہیں آپ کی کیا رائے ہے؟

میں نے اُسے آسان زبان میں سمجھایا کہ پاکستان تو ایک فلاحی اسلامی ریاست ہے۔اس کی بنیاد کلمہ طیبہ ہے۔اسلام کی تعلیمات پر صدق دل سے عمل ہو تو سیکولرزم جیسے نعروں کی معنویت ختم ہو جاتی ہے۔اسلام حقوق نسواں کا علم بردار ہے۔بنیادی حقوق کی ضمانت دیتا ہے۔تمام مذاہب کو آزادی عقیدہ وعمل فراہم کرتا ہے۔ملک کی ترقی میں سارے شہریوں کی حصہ داری کو یقینی بناتا ہے۔اب اگر بیوروکریسی بے ایمان ہے، سیاست داں بے عمل ہیں، عوام اسلام سے دور ہیں تو اِس میں مذہب کا قصور نہیں ہے۔ امریکہ، یوروپ اور مغربی ممالک میں سیکولرزم کی حکمرانی ہے۔حکومت کا کوئی سرکاری مذہب نہیں مگر مسلمانوں پر عالم اسلام پر ترقی اور گلوبلائزیشن کے سنہرے نعروں کے ساتھ سب سے زیادہ ظلم یہی ممالک کرتے ہیں۔ پاکستان میں سیکولرزم کا نعرہ ایسا ہے جیسے کوئی عہدِ نبوی میں مدینہ میں سیکولرزم کا دعوی کرے۔

مناہل کا دوسرا سوال مغربی جمہوریت اور اسلام کے متعلق تھا۔

میں نے اُسے سمجھایا کہ مغربی جمہوریت ایک فلسفہ اور نظریہ زندگی کی حیثیت میں اسلام سے متصادم ہے۔مغرب کے فکر وفلسفہ کی عمارت انکار خدا اور ردِّ مذہب پر استوار ہوئی ہے۔اس میں روحانی اور اخلاقی اقدار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مادہ پرستی سے اوپر اٹھ کر غیب اور مصنوعی اخلاقیات وامور سے بَیر ہے۔اسلام کا فلسفہ ایمانیات پر، اُس کا نظامِ زندگی عقائد وعبادات اور معاملات کے آمیزہ پر تشکیل پایا ہے۔غیب اور مشاہدہ، روح اور مادّہ، ایمانیات اور عقائد واحکام کا ایک متوازن نظام اسلام پیش کرتا ہے۔

جمہوریت ایک طریقہ حکومت کے طور پر اسلام سے قریب تر ہے۔اکثریت کے ذریعہ حلّ مسائل، باہمی مشاورت کے راستے قانون سازی اور اصلاحی تدابیر کا نفاذ، اختلاف کی صورت میں کثرت تعداد کی بنیاد پر فیصلہ اسلام کے نظام شوریٰ سے میل کھاتا ہے۔

اگلا سوال، جو ہر پاکستانی شہری کی زبان پر ہوتا ہے، ملک میں آئین وقانون کی پاس داری نہ ہونے کے اسباب سے متعلق تھا۔میں نے مناہل کو قائل کرنے کی کوشش کی۔سیاست داں خود اپنے مفاد کے لیے قانون کو توڑ دیتے ہیں۔عوام کے اندر آئین سے محبت ناپید ہے۔اس صورتِ حال کا تدارک

یہی ہوسکتا ہے کہ ہر شخص اپنی سطح پر جواب دہی محسوس کرے۔ سیاست داں، علماء، اساتذہ، عام شہری کوئی قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لے اور اختلافات کو حل کرنے کے لیے عدلیہ پر اعتماد کرے۔

مناہل کو میری باتیں کتنی سمجھ میں آئیں، مجھے نہیں معلوم۔ اُس کے سوالات سے ذہانت ولیاقت چھلک رہی تھی۔

تہذیبِ حجاب کی شرطیں

ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب نے ڈاکٹر عنبرین علی اوران کی بیٹی مناہل کو تاکید کی۔ وہ میری کتاب ''تہذیبِ حجاب اور خواتین'' ضرور پڑھیں۔ ۲۵۴ صفحات پر مشتمل میری یہ کتاب پبلی کیشنز ڈویژن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۲۰۱۷ء میں شائع کی ہے۔ تہذیبِ حجاب کے آٹھ شرعی تقاضوں پر علامہ محمد ناصر الدین البانیؒ (۱۹۱۴-۱۹۹۹ء) نے اپنی معروف کتاب۔ "**حجاب المرأة المسلمة فی الکتاب والسنة**" میں گفتگو کی ہے۔ میں نے اس کتاب میں اُن کا حوالہ دیا ہے۔ گھر سے باہر نکلتے وقت خاتونِ اسلام کو ایسا لباس زیب تن کرنا چاہیے جو

۱۔ چہرہ اور دونوں ہاتھوں کے سوا پورے بدن کو چھپا سکے۔
۲۔ لباس بجائے خود زینت نہ ہو۔
۳۔ اتنا باریک نہ ہو کہ بدن جھانکتا نظر آئے۔
۴۔ چست اور تنگ نہ ہو کہ جسمانی نشیب وفراز نمایاں ہو۔
۵۔ کسی خوشبو کا استعمال نہ ہو۔
۶۔ مردوں کے لباس کے مشابہ نہ ہو۔
۷۔ کافر عورتوں سے کوئی تشبیہ نہ ہو۔
۸۔ شہرت اور خودنمائی کا لباس نہ ہو۔

نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے مسجد پہنچے تو خطیبِ محترم غیر سودی معیشت کی تبلیغ کر رہے تھے اور سود کے خلاف اعلانِ جنگ کا انھوں نے عام مسلمانوں سے مطالبہ کیا۔

۱۔ سودی بینکوں سے اپنے کھاتے ختم کرائیں۔

۲۔اسراف اور فضول خرچی سے بچیں اور حلال آمدنی پر قناعت کریں۔
۳۔غیر سودی کاروبار کو تقویت پہنچائیں۔صاحبِ مال اپنی دولت اسلامی بینکوں میں جمع کردیں۔
۴۔سود کی حرمت کی عام تبلیغ کریں۔
۵۔غیر سودی بینک کاری کی تحریک چلائیں اور حکومت پر دباؤ بنائیں۔

نماز جمعہ کی ادائیگی سے فراغت ہوئی تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر محمد شفیق انجم مجھے یونیورسٹی پہنچا کے فوراً واپس بہاولپور چلے گئے۔انھوں نے جمعہ کی نماز راستے کی کسی مسجد میں ادا کی ہوگی۔صدر شعبہ نے یہ خبر بھی دی کہ مجھے دو دنوں تک اُن کے دولت کدے میں قیام کرنا ہوگا۔اگلے دو دنوں میں مہمان خانہ میں ہجوم ہوگا۔یونیورسٹی کی سینیٹ کا اجلاس پہلے سے طے ہے اب سمجھ میں آیا کہ ڈاکٹر ابوالحسن شبیر احمد بہاولپور کی پیش کش اُن کی فیاضی ہی کی غماز تھی اور میں نے بے رحمی سے وہ پیش کش مسترد کردی تھی۔ خاطرِ احباب کا خیال بھی اُس وقت نہ آیا تھا۔

انگریزی ادب کا مطالعہ

پروفیسر صہیب نے اپنے مکان کے بالائی حصہ کا کمرہ تمام تر لوازمات وسہولیات کے ساتھ میرے لیے آراستہ کردیا تھا۔کھلا صحن دھوپ کا مزہ لینے اور بہ آواز بلند قرآن کی تلاوت کرنے کے لیے موجود تھا۔شیلف میں کتابیں بے ترتیبی سے لگی ہوئی تھیں۔لطف آ گیا کہ اسلامی علوم کا ایک استاد انگریزی ناولوں اور کہانیوں سے بھ شغف رکھتا ہے۔

- The clops by Sloane Crosby
- Men without women by Haruki Murakami
- How they met and other stories by David Lavia them
- Life, the universe and every thing by Douglas Adams
- The Restaurant at the End of the universe be Douglas Adams

اردو میں علامہ محمد اقبال کی ضرب کلیم اور جون ایلیا کا مجموعۂ کلام بھی بستر کے سرہانے پڑا تھا۔ پروفیسر صہیب سے میں نے ان ناولوں کا تذکرہ کیا تو میری خوش فہمی رفع ہوگئی۔یہ کتابیں اُن کے صاحب

زادے عکراش کے مطالعہ میں رہتی ہیں۔ یہ اُسی کا کمرہ تھا۔ آج کل لاہور میں اپنی بیوی کے ساتھ مقیم ہے۔ وہاں کسی کمپنی میں اُسے ملازمت مل گئی ہے۔ بیٹے کی خوش حالی کا ذکر باپ کے چہرے کو گلنار کر دیتا ہے، اس کا مشاہدہ میں نے پروفیسر صہیب اور مولانا سلطان احمد اصلاحیؒ کے چہروں پر کیا ہے۔

دی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے عزیزوں نے ڈاکٹریٹ کے تین مقالات میرے حوالے کیے تھے کہ میں پاکستان میں قیام کے دوران اُن کا مطالعہ کر کے اپنی تجزیاتی رپورٹ رجسٹرار آفس کو جمع کر دوں۔ ۳/ دسمبر ۲۰۲۲ء کو میں نے اسی کام کے لیے فارغ کیا اور تعمیل حکم میں اپنی رائے صداقت و دیانت کے ساتھ جمع کر دی:

۱۔ خطبات رسولؐ کی عصری معنویت اور اُن سے مستنبط احکام کا علمی جائزہ۔
عمر بلال ساجد، شعبہ علوم اسلامیہ، نگراں ڈاکٹر عبدالغفار

۲۔ صارفین کے حقوق سے متعلق شرعی اور وضعی قوانین کا علمی جائزہ۔ عصر حاضر کے تناظر میں
حافظ محمد ارشد حبیب، شعبہ فقہ و شریعت، نگراں ڈاکٹر عبدالغفار

۳۔ فقہی اصول ''دفعِ ضرر و رفعِ حرج'' کا منتخب فقہی تفاسیر کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ اور عصری تطبیقات
(**احکام القرآن الکیاھراسی الشافعی، احکام القرآن لابن العربی المالکیؒ، زاد المسیر فی علم التفسیر لابن الجوزی الحنبلیؒ اور احکام القرآن اشرف علی تھانویؒ**)
محمد مدنی، شعبہ قرآن و تفسیر، نگراں، ڈاکٹر حافظ سلطان محمود

ان تینوں مقالات پی ایچ ڈی کا میں ممتحن تھا۔ میں نے مفصل رپورٹ بنائی۔ منہجی مسائل بھی اٹھائے۔ فقہی توسع کی طرف بھی اشارے کیے اور ان تینوں لائق و فاضل طلبہ کو ضروری کارروائی کے بعد ڈگری عطا کرنے کی سفارش کی۔

زیرِ تکمیل اسلامک سینٹر

۴/ دسمبر ۲۰۲۲ء کی تاریخ گل گشت کالونی کی نذر ہوئی۔

ناشتہ میں ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب نے خواتین کے لیے درس قرآن تحریک کا تعارف کرایا۔ دو بہنیں جو اسلامی جمعیت طالبات کا پس منظر رکھتی ہیں، الہدیٰ اور النور کے نام سے ٹیلی ویژن چینل چلا رہی ہیں۔ با حجاب درس کے ذریعہ خواتین کی ذہنی وفکری تربیت کے ساتھ یہ دونوں غیر سرکاری انجمنیں ملک کے باہر بھی مقبول ہیں۔

ناشتہ سے فارغ ہوئے تو ڈاکٹر حفیظ انور مرحوم کی تعزیت کے لیے ان کے صاحب زادے کے گھر حاضر ہوئے۔ گل گشت کالونی سے ان کا مکان تحریک اسلامی کے علماء دانش وروں اور رہنماؤں کا مرکز تھا۔ ملتان جب بھی حاضری ہوئی انھوں نے اپنے صرفے پر ایک پُر تکلف عشائیہ کا نظم کیا۔ درجنوں مشاہیر کو مدعو کیا اور مجھے اسلامی احیاء واقامت اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر کھل کر گفتگو کرنے کا موقع فراہم کیا۔

اس کالونی میں ذرا فاصلے پر اسلامک سینٹر کی عظیم الشان عمارت بھی واقع ہے۔ وقیع وعریض جامع مسجد مکمل ہو چکی ہے۔ نماز ظہر ہم نے اسی مسجد میں ادا کی۔ ۱۵۰ طلبہ کی اقامت گاہ تکمیل کے آخری مرحلہ میں ہے۔ اس عظیم منصوبے کی پشت پر نوجوان نسل کی دینی وعلمی تربیت کا منصوبہ کارفرما ہے۔ جماعت اسلامی نے تقسیم سے پہلے ثانوی درس گاہ رام پور کا جو منصوبہ بنایا تھا اور جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو تحریک اقامت دین کے علمی وفکری محاذ کی قیادت سنبھالنے کی جو مہم جوئی کی تھی، اُسی کا بلیو پرنٹ غالباً اسلامک سینٹر ملتان کے ارباب حل وعقد کے سامنے تھا۔

ابھی فوری طور پر اسلامک سینٹر کے ذمہ داران چاہتے ہیں کہ ماسٹرز کا کورس مکمل کر کے ایم فل کے طلبہ کو اس ہوسٹل میں داخلہ دیں جن کی تعلیم وتدریس اور علمی وفکری تربیت کا خاکہ ابھی زیر غور ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب سے انھوں نے مشاورت کی۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان اور دوسری عصری جامعات اس دولہ سالہ ایم فل کورس کی منظوری عطا کر دیں۔

وسیع وعریض مسجد کی پشت پر خوبصورت لان واقع ہے جس میں ہوسٹل کے کمروں کی کھڑکیاں کھلتی ہیں۔ مسجد کے زیریں حصے میں جماعت اسلامی صوبہ پنجاب کے دفاتر، مہمان خانہ اور ایک بڑا کانفرنس ہال ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب نے تجویز رکھی۔ مسجد کے بالائی حصہ کو خواتین کی نماز کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ اب سلفی مراکز اس کا اہتمام کرنے لگے ہیں مگر دینی واسلامی فکر کو ابھی

تحفظات لاحق ہیں۔علماء مذبذب ہیں تحریک اسلامی کے حلقوں میں بھی کافی لیت ولعل موجود ہے۔تاہم یہ صراحت ہوئی کہ اسلامک سینٹر کے دامن میں خالی قطعۂ زمیں خریدنے اور اُسے خواتین کا مرکز بنانے کا منصوبہ زیرغور ہے۔

گل گشت کالونی ہی میں حجامت کا انتظام ہوااور وہاں سے یونیورسٹی مہمان خانہ منتقل ہوگئے۔شام کو نماز مغرب کے بعد پروفیسر صہیب نے اطلاع دی۔النعمت ریستوران گل گشت میں عشائیہ کا اہتمام ڈاکٹر عبدالرحمٰن قاسمی نے کیا ہے۔ہم لوگ ریستوران پہنچے تو میزبان منتظر تھے۔انھوں نے گھریلو دسترخوان کا بھی نظم کیا تھا۔سبزی اور مرغ کا گوشت اُن کی بیوی نے خاص میرے لیے تیار کیا تھا۔مچھلی کا لذیذ خوان ریستوران کی طرف سے تھا۔وہاں سے فراغت کے بعد مہمان خانہ پہنچے تو ڈاکٹر قاسمی نے اپنی تازہ تخلیق ہدیہ کی۔''غذائی اشیاء:حلّت وحرمت کے شرعی اصول واحکام''،عکسی پبلی کیسنز (لاہور)۲۰۲۲ء صفحات ۴۶۴۔

حلال جانوروں کا پیشاب

یہ اشاعتی ادارہ کتاب محل لاہور ہی کا ہے جس کے فریب کا شکار فاضل مصنف بھی ہوئے۔ راقم بھی کتاب محل کا صیدزبوں رہا ہے۔اس کی دو معروف کتابیں بغیر اجازت اور حقوقِ طباعت حاصل کیے وہ شائع کر چکا ہے۔

۱۔یہودی مغرب اور مسلمان

۲۔عقلیاتِ قرآن کریم

ڈاکٹر غازی عبدالرحمٰن قاسمی نے اصرار کیا کہ اُن کی کتاب کی اشاعت دوم کے لیے کوئی تقریظ تیار کردوں۔دوبارانھوں نے یاددہانی کرائی توحسبِ ذیل تحریر میں نے تیار کردی:

> ڈاکٹر غازی عبدالرحمٰن قاسمی قابلِ تحسین وتبریک ہیں کہ ''غذائی اشیاء: حلّت وحرمت کے شرعی اصول واحکام'' میں انھوں نے اسلامی شریعت کی متوازن ترجمانی کی ہے اور فکر وتحریک دیوبند اور مکتب احناف سے گہرا تعلق رکھنے کے باوجود ائمہ اربعہ کی آراء اور اُن کے دلائل شرح وبسط سے بیان

کیے ہیں۔کسی مخصوص فقہی رجحان پر اصرار کرنے کی جگہ انھوں نے مصلحین ومجددین فکر اسلامی سے استفادہ کو ترجیح دی ہے۔عربی مآخذ کا بھرپور حوالہ دیا ہے۔عربی عبارت کو من وعن نقل کر کے اپنی طہارتِ فکر اور شفافیت کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

حلال جانوروں کے پیشاب سے طبی غرض کے لیے استفادہ ایک دلچسپ بحث ہے۔(ص:۴۳۶-۴۳۵) فاضلِ مصنف نے امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ اور ساتھ ہی امام شافعیؒ کی تحریمی رائے نقل کی ہے اور امام محمدؒ، فقہائے مالکیہ وحنابلہ کی رائے کا بھی حوالہ دیا ہے جس کے مطابق "**ماکول اللحم**" کا پیشاب علاج کے لیے طاہر اور جائز ہے۔آخر الذکر فقہاء نے حدیثِ عرینہ (بخاری، الجامع الصحیح، جلد ا، ص:۵۶، نمبر ۲۳۳) سے استدلال کیا ہے جبکہ اول الذکر فقہاء کا استدلال دار قطنی، السنن جلد اول، ص:۲۳۲، حدیث ۴۶۴ اور دوسری احادیث سے ہے۔اس باب میں مصنف نے الکاسانی کی بدائع الصنائع، جلد اول، ص:۶۱ کا حوالہ دیا ہے۔اس ایک مثال سے واضح ہوتا ہے کہ کتاب میں دیانت کے ساتھ متانت بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔

یہ کتاب اگر عام فہم زبان میں ہوتی تو ترسیل کا مقصد احسن طریقہ سے پورا ہوسکتا تھا۔علمی وفقہی زبان میں گفتگو شاید مصنف کی بھی مجبوری ہے کہ اصطلاحات فقہیہ ادق ہوتی ہیں مگر اُن کے بغیر گزارہ بھی نہیں۔مصنف مبارک باد کے مستحق ہیں اور ہماری دعاؤں کے بھی بھی۔

(ڈاکٹر) عبیداللہ فہد
پروفیسر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیوسٹی
علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲ (انڈیا)

زکوۃ اور جدید مسائل

پروفیسر عبدالقدوس صہیب نے ۳۳۰ صفحات پر مشتمل اپنا ایک مسودہ بھی میرے حوالے کیا ''زکوۃ اور جدید مسائل'' میں نے اسے از اول تا آخر پڑھا۔ کچھ ترمیمات تجویز کیں۔ تبویب میں حذف واضافہ کیا اور پیش لفظ لکھ کر اُن کے حوالے کر دیا۔ خدا کرے جلد شائع ہو جائے۔ زکوۃ پر لٹریچر دستیاب نہیں ہے۔ یہ امت کی بدنصیبی ہے کہ ہر مجموعۂ حدیث میں زکوۃ پر ایک باب موجود ہونے کے باوجود اردو اور عربی میں کتابیں عنقا ہیں۔ شیخ یوسف القرضاویؒ کو اللہ غراقِ رحمت کرے کہ اُن کی تصنیف فقہ الزکوۃ بازار میں آئی اور دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔

تکثیری معاشرہ کے اسلامی تقاضے

۵/ دسمبر ۲۰۲۲ء کو ساڑھے گیارہ بجے بہاء الدین زکریا یونیورسٹی شعبہ علوم اسلامیہ کے پی ایچ ڈی اسکالرز سے باہمی تعامل کا اجلاس تھا۔ نظامت صدر شعبہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب کر رہے تھے۔ موضوع ''مسلم دانش وری کے حالیہ رجحانات وموضوعات کا مطالعہ عالم اسلام کے چنیدہ مفکرین ومصنفین کے حوالے سے تھا۔''

میں نے اپنی گفتگو میں تین زیرِ بحث موضوعات پر توجہ مرکوز رکھی۔ تکثیری معاشرہ اور فقہ الاقلیات، مقاصد شریعت کی تجدید وتوسیع اور صحابیات کے سماجی کردار کی بازیافت۔

فقہ الاقلیات اور تکثیری معاشرہ

یعنی مسلم اقلیات کے تنوع، مسائل وتحدیات کی پیچیدگی، اسلامی تشخص کے ساتھ ملک کی تعمیر وترقی میں اُن کی شراکت، اکثریت کے جبر وجارحیت کے خلاف اُن کا دفاع وغیرہ مباحث سے تعرض کرنے والی فقہ کی تشکیل، ہماری فقہ دورِ حکم رانی میں تیار کردہ قانون فہم وتعبیر کی عکاسی کرتی ہے۔ دورِ محکومت کے پیچیدہ تر مباحث اُس کے جائزہ سے باہر ہیں، آج تکثیریت کے تقاضے یکسر مختلف ہیں۔ شراکتِ اقتدار کا موضوع اس وقت زیرِ بحث ہے۔ اس موضوع پر داد تحقیق دی ہے بطورِ خاص درج ذیل

دانش وروں نے:

(۱) ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی (۲) سید محمد نقیب العطّاس (۳) راشد الغنوشی (۴) محمد فتحی عثمان (۵) انور ابراہیم (۶) عزّام تمیمی (۷) علی بولاک (۸) محمد ابونمر (۹) محمد یٰسین مظہر صدیقی (۱۰) سید جلال الدین عمری (۱۱) ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی (۱۲) ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی۔

مقاصد شریعت کی تجدید وتوسیع

امام الحرمین الجوینیؒ، امام ابواسحٰق الشاطبیؒ، امام ابوحامد الغزالیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے لے کر دورِ جدید کے محمد علاّم الغاسی اور محمد طاہر بن العاشور نے عصری تقاضوں کی روشنی میں مقاصد شریعت کی تفہیم کی ہے مگر اب حالات یکسر بدل چکے ہیں اور تقاضے بھی۔ اہم تر مسائل ان بحثوں میں نظر انداز ہوئے ہیں جیسے ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی (۲۰۲۲-۱۹۳۱ء) نے حسبِ ذیل امور کو مقاصد میں شمار کرنے پر زور دیا ہے:

۱۔ انسانی عزّ وشرف
۲۔ حقوق انسانی اور آزادی
۳۔ عدل وانصاف
۴۔ عام کفالت اور ازالۂ غربت
۵۔ سماجی مساوات اور تقسیم دولت کا منصفانہ نظام
۶۔ امن وامان اور نظم ونسق
۷۔ بین الاقوامی سطح پر تعامل وتعاون

تیونس کے محمد طاہر بن العاشور (۱۹۷۳-۱۸۷۹ء) نے اس موضوع پر اپنی تحقیق پیش کی اور اجتہاد کرنے پر زور دیا:

مقاصد الشریعة الاسلامیة (تیونس ۱۳۶۶ھ)

متعدد دیگر دانش ور ہیں جن کا مطالعہ دلچسپ ہے اور قابلِ بحث بھی:

— اسماعیل الحسنی — **نظریة المقاصد عند الامام محمد الطاهر ابن العاشور،**

المعهد العالمی للفکر الاسلامی (واشنگٹن، ۱۹۹۵ء)

— احمد یسونی — نظریة المقاصد عند الامام الشاطبی، الدار العالیة للکتاب الاسلامی (ریاض، ۱۹۹۲ء)

— محمد سعد بن احمد بن مسعود الیوبی — مقاصد الشریعة الاسلامیة وعلاقتها بالادلّة الشریعة، دار الهجرة (ریاض، ۱۹۹۵ء)

— محمد مصطفیٰ الزحیلی — فصل مقاصد الشریعة — موسوعة قضایا اسلامیة معاصرة (دار کتبی، جلد: ۵)

— ابراہیم الکیلانی — فی مظاهر التجدید فی المبحث المقاصد

— ماذن موفق ہاشم — دعوتنا الیٰ التجدید والتوسیع فی المقاصد (۱۹۹۶ء)

اسلامی فقہ اکیڈمی نئی دہلی نے ۲۱-۲۵/ دسمبر ۲۰۰۳ء میں ایک کارگاہ منعقد کی جس میں عالم عرب سے ڈاکٹر صلاح الدین عبدالحلیم سلطان نے شرکت کی اور ہندوستان کے اکابر علماء میں سے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا واضح رشید ندوی، پروفیسر محمد اجتباء ندوی، مولانا انیس الرحمٰن قاسمی، مولانا سید جلال الدین عمری، مولانا اسرار الحق قاسمی، پروفیسر محسن عثمانی ندوی اور مولانا بدر الحسن قاسمی شریک ہوئے۔ جوان العمر علماء میں سے پروفیسر محمد فہیم اختر ندوی، مولانا صباح الدین فلاحی قاسمی، عتیق الرحمٰن ندوی، امتیاز احمد قاسمی، احمد نادر قاسمی اور محمد ہشام الحق ندوی وغیرہ مباحثہ میں شریک ہوئے۔ اس کی روداد بھی شائع ہو چکی ہے:

مقاصد شریعت — تعارف اور تطبیق (ایفا پبلی کیشنز [نئی دہلی] جولائی ۲۰۰۴ء، صفحات: ۵۲۱

اس روداد کی تدوین جدید اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی طبع ہو چکا ہے:

Objectives of Shariah- Introduction and Application

Selected papers of the workshop organized by the Islamic Fiqh Academy India in collaboration with the international institute of

Islamic thought U.S.A. on December 21-25, 2003 in New Delhi). Edited and translated by Dr. Obaidullah Fahad, Dar Al- Kotob, Al-Ilmiyah Beirut, 2015 AD/1436H., 448 pp.

صحابیات کا سماجی کردار

یہ میری گفتگو کا تیسرا نکتہ تھا۔ دورِ نبوی میں خواتین کا جو مثالی کردار تھا اس پر فقہی تاویلات کے دبیز پردے ڈال دیے گئے ہیں۔ مصری عالم شیخ ابوعبدالرحمٰن عبدالحلیم محمد ابوشقہ نے پانچ ضخیم جلدوں میں امہات المومنین اور صحابیات سے متعلق احادیث کو جمع کر دیا ہے۔ اس تاریخ ساز کتاب کا نام ہے: "**تحریر المرأة في عهد الرّسالة**" فاضل مصنف نے اس رجحان ساز کتاب میں چودہ کتب احادیث سے استفادہ کیا ہے:

صحاح ستّہ کے علاوہ کتاب **الموطّا امام مالک، زوائد صحیح ابن حبّان، مسند احمد، المعجم الکبیر للطبرانی، المعجم الاوسط للطبرانی، المعجم الصغیر للطبرانی**، اور **مسند ابی یعلیٰ**۔

فہرست کتاب سے چند عنوانات دیکھیے، خواتین اسلامی کی سماجی سرگرمیوں میں شرکت کی قطعیت خود بخود واضح ہو جائے گی۔

باب اول: بخاری و مسلم میں عورت کی شخصیت

باب دوم: معاشرتی زندگی میں مسلمان خاتون کی شرکت

باب سوم: معاشرتی زندگی میں عورت کی شرکت اور مردو سے اس کی ملاقات کی مخالفت کرنے والوں کے اعتراضات۔ یہ تبویب اُس ضخیم تصنیف کی شاندار تلخیص سے مستفاد ہے جو ڈاکٹر احمد کیسی نے ایک جلد میں تیار کی ہے اور اس کا اردو ترجمہ ہو گیا ہے۔

خواتین کی آزادی عہدِ رسالت میں

شیخ ابوعبدالرحمٰن عبدالحلیم محمد ابو شقہ، تلخیص ڈاکٹر احمد کیسی، اردو ترجمہ از حسنین ندوی،

صفحات:۶۰۱۔المعہد العالی للفکر الاسلامی، ہیرنڈن، ورجینیا،۲۲۰۷۰،امریکہ۔

۲۰/جنوری ۲۰۱۵ء کو اسمبلی ہال پالی ٹیکنیک، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اس موضوع پر ایک اہم سیمینار منعقد ہوا جس کی روداد شائع ہوئی تو اس میں موقر اساتذہ کے بھی مقالات شامل کیے گئے۔

Empowerment of Women under the Prophet of Islam

Edited by Obaidullah Fahad and Muhammad Salahuddin Umari Seerat Committee, Aligarh Muslim University, 2015, 800pp.

پی ایچ ڈی اسکالرز کے اِس اجلاس میں میری تمہیدی گفتگو مکمل ہوئی تو طالبان تحقیق کے موضوعات پر بھی مشاورت ہوئی اور حسبِ ذیل موضوعات تجویز کیے گئے:

۱۔ نازیہ یونس : مسلمانوں کے درمیان بین المسالک افہام وتفہیم یوٹیوب چینل کا تجزیاتی مطالعہ

۲۔ مہرین ثمر : پاکستان میں اسلامی بنک کاری کا تنقیدی مطالعہ

۳۔ سعدیہ ریاض : قرآن مجید میں طبّی علوم

۴۔ نسرین اختر : کیرین آرم اسٹرانگ کا مطالعہ سیرت-ایک تجزیہ

۵۔ امیر زماں : دورِ رسالت میں خواتین کے حقوق اور معاصر مسلم معاشرہ

۶۔ بلال قدیر : قرآن مجید کا مطالعۂ مذاہب عصری تناظر میں

۷۔ علی حسن : اسلامی شوریٰ اور مغربی جمہوریت-ایک تقابل

۸۔ محمد قاسم : اکیسویں صدی میں علمائے دیوبند کی تفسیری خدمات

ان موضوعات کی عصریت اشارہ کرتی ہے بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کے اساتذہ وطلبہ تاریخ کے حصار میں ملفوف نہیں ہیں۔انھیں زمانے کا ادراک ہے۔اسلامی متون سے وابستگی کے ساتھ عصری تقاضوں کا عرفان بھی انھیں حاصل ہے۔

اسلامیات میں تخلیقی تحقیق

آج ۲ر بجے سے شعبہ علوم اسلامیہ کے ایم فل طلبہ وطالبات سے روبرو ہونا تھا۔ موضوع خطاب تھا: علوم اسلامیہ میں ابداعی تحقیق، دائرہ کار اور منہج۔

میں نے درج ذیل نکات پر اظہار خیال کیا۔ ناظم اجلاس تھے پروفیسر ڈاکٹر محمد ادریس لودھی:

۱۔ آزادانہ ومجتہدانہ تحقیق کے تقاضے

۲۔ موضوع کی حمایت ومخالفت میں تحریر کردہ دلائل کا مطالعہ

۳۔ ہر شخصیت کو پرکھنے کا واحد معیار کتاب وسنت

۴۔ روایات ورسوم اور تعصّبات سے اجتناب

۵۔ اظہارِ اختلاف کی جرأت مگر متانت اور سلیقہ کے ساتھ

میری گفتگو مکمل ہوئی اور اب سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایم اے مکمل کر کے طلبہ نے ابھی ایم فل میں داخلہ لیا تھا۔ سوالات کی نوعیت عمومی تھی مگر میں نے بھرپور دل چسپی کا اظہار کیا اور ناظم اجلاس کی قطعی صراحت بھی تھی کہ دین سے متعلق کسی قسم کے خلجان، اضطراب اور اشکال کو کھل کر ظاہر کریں، فاضل خطیب کو جواب دینے میں خوشی ہوگی۔

ایک طالبہ نے چھوٹتے ہی حجاب کے ڈیزائن پر سوال کر دیا۔ عبایا، چادر یا طالبانی طرز -کون سا ڈیزائن اچھا اور اسلام سے قریب ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ڈیزائن کی صراحت نہیں ہے۔ ستر پوشی مقصود ہے جس حجاب سے ستر پوشی ہو جائے وہی اسلامی ہے۔ میرا جواب صریح تھا۔

ایک طالب علم نے داڑھی اور مونچھ کی طوالت اور کمیت پر سوال کیا۔

میں نے عرض کیا احادیث میں طوالت پر کوئی بیان نہیں ہے۔ حکم یہ ہے کہ مونچھوں کو گھٹاؤ اور داڑھی کو بڑھاؤ۔ میرا خیال ہے کہ داڑھی اتنی طویل ہو کہ شناخت ممکن ہو سکے اور تشبّہ کا خطرہ نہ رہے۔

اسلاف سے اختلاف

ایک سن رسیدہ طالب علم نے اپنا درد بیان کیا:

آزادیٔ تحقیق، جس پر آپ زور دے رہے ہیں، فی الحال ممکن نہیں۔ سماج کا دباؤ ہے۔ رسوم وروایات کی گرم بازاری ہے۔ فقہی مکاتب کی گھیرابندی ہے۔ ان حالات میں آزادانہ تفکر محال ہے!

میں نے عرض کیا۔ مشکلات اُس سے زیادہ ہیں جن کا آپ نے تذکرہ کیا ہے مگر فکر اسلامی کے تئیں وفاداری کا تقاضا ہے کہ ان مشکلات کا مقابلہ جرأت اور فراست سے کیا جائے۔ مصلحین امت نے اِن تمام گھاٹیوں کو عبور کر کے ہی اصلاح وتجدید کی ذمہ داری نبھائی ہے۔ ہمیں اِس مہم میں اپنی حصہ داری طے کرنی ہے۔

ایک خاتون نے چہرے کے پردے کے بارے میں مولانا مودودیؒ کے موقف کی صراحت کی۔

میں نے عرض کیا۔ محدث عصر علامہ ناصر الدین البانیؒ کا موقف زیادہ صحیح ہے۔ مولانا مودودیؒ متکلم ومجدد اسلام ہیں، محدث نہیں۔ احادیث کے تئیں اُن کا موقف کہیں کہیں محدثین کرام سے ہٹ کر ہے۔ چہرہ اور دونوں ہاتھوں کو کھولنے کی اجازت فقہائے اربعہ کے ہاں تسلیم شدہ ہے۔

ایک طالبہ نے برجستہ اپنا اشکال پیش کیا:

اسلاف کی رائیں بھی قرآن وسنت پر استوار اور اُن سے مستفاد تھیں۔ آخر اُن سے اختلاف کیسے کیا جائے؟

میں نے تحمل سے کہا۔ قرآن وسنت کے فہم پر اسلاف نے اپنی رائے قائم کی تھی۔ وہ تمام تر احترام کے باوجود انسانی فہم تھا، وحی الٰہی نہیں تھا۔ ان تمام افکار وعطایا سے استفادہ ضروری ہے مگر معیارِ حق قرآن وسنت ہے۔ اسلاف نے اپنے حالات اور تقاضوں کا ادراک کیا اور نصوص اسلامی سے کسب کیا۔ یہی کام ہمیں بھی کرنا ہے۔ یہ اسلاف کی مخالفت یا توہین نہیں، اُن کے اختیار کردہ منہج کا اتباع ہے۔

طلبۂ مدارس کی فرقہ واریت

ایک خاتون نے اپنی ذاتی الجھن بیان کی:

پورا وقت پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ کی تیاری میں صرف ہوجاتا ہے۔ مطلوبہ مواد کی تلاش کے لیے وسیع اور طویل خواندگی، میسر مواد کی ترتیب،

سپروائزر سے بار بار مشاورت، نظر ثانی اور پھر آخری مرحلہ مشینی کتاب
وقت ہی نہیں بچتا کہ علمی مضامین لکھے جائیں۔

میں نے عرض کیا۔ ترجیح اول مقالۂ ڈاکٹریٹ کی تیاری وترتیب ہو۔ مگر جو مواد پی ایچ ڈی میں شامل نہ ہو سکے اسے الگ سے مرتب کرلیں۔ اسی طرح خواندہ مواد سب موضوع سے متعلق نہیں ہوتا۔ انھیں الگ جمع کرتے جائیں۔ اس مرحلۂ جمع وترتیب میں اساتذہ سے مشاورت ضرور کرتے رہیں اور کوشش کریں اپنے موضوعِ ڈاکٹریٹ کے اطراف وجوانب پر کوئی علمی مذاکرہ ہو تو اس میں اپنے مقالے کے ساتھ ضرور شرکت کریں۔ اس طرح چار پانچ سال کے عرصے میں مقالات کی ایک خاصی تعداد جمع ہو جائے گی۔

ایک طالب علم نے سنجیدگی سے پوچھا:

علوم اسلامیہ کے شعبوں میں طلبہ وطالبات کی اکثریت کسی مدرسہ سے فارغ ہوتی اور کسی فقہی مکتبِ فکر سے وابستہ ہوتی ہے۔ ایسے طلبہ اکثر فرقہ وارانہ ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس صورت کا تدارک کیسے ہو؟ اگر وہ حنفی فقہ سے وابستہ ہیں تو دوسرے مکاتبِ فقہ کے تئیں عدم رواداری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اہلِ حدیث ہیں تو احناف اُن کا اولین ہدف ہوتے ہیں!

یہ سب سے بڑا المیہ ہے۔ میں نے تاسف سے کہا۔ مدارس کے طلبہ اسلام کے نہیں، مسلک کے مبلغ ہوتے ہیں۔ عصری جامعات میں اساتذہ کو اُن کی فکری تطہیر وتعمیر میں بڑی فراست اور حکمت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ تمام مکاتبِ فقہ کا احترام، کہ وہ اسلامی میراث کا ناگزیر حصہ ہیں، ضروری ہے تاہم یہ بھی ناگزیر ہے کہ امتِ مسلمہ کے وسیع تر مفاد میں اُن طلبہ کو قرآن مجید اور احادیث نبویہ سے راست رجوع کرنے کی تعلیم دی جائے اور مسلکی تقارب کا ماحول بنایا جائے۔

مغرب کا دانش استعمار

ایک طالب علم کو تشویش تھی۔ مغرب کا فکر وفلسفہ اور اس کا مکر واستعمار ہمہ گیر ہے۔ اُس سے

آزاد ہو کے سوچنا اور علمی اقدام کرنا بہت مشکل ہے۔

میں نے کہا۔ مشکل ہے ناممکن نہیں ہے۔ حالات کا جغرافیہ وسیاست کا مقامی عادات ومالوفات کا انسان کی فکری تشکیل پر اثر پڑتا ہے اور اسی سے عمرانی وسماجی علوم میں تنوع اور ارتقا ہوتا ہے۔ علامہ ابن خلدون (۱۴۶۰-۱۳۳۲ء) نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف المقدمہ میں اِن خارجی تاثیرات وعوامل کی کارفرمائی کو تسلیم کیا ہے۔ مگر قرآن وسنت کے نصوص وحیِ الٰہی ہیں، اِن تاثیرات سے بے نیاز ہیں۔ اِن کی روشنی میں اپنا محاکمہ واحتساب ہوتے رہنا چاہیے۔

علامہ محمد اقبال بھی تو انسان ہی تھے۔ مغرب کی ہواؤں میں سانس لیتے رہنے کے باوجود اپنا تجربہ بیان کر گیے:

زمستانی ہوا میں اگر چہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

اس غزل کا آخری شعر ہے:

سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے
وہی عبرت، وہی عظمت، وہی شانِ دل آویزی

اور اُن کا یہ اعتراف تو چار دانگ عالم میں مشہور ہے:

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ ونجف

اسلامی-غیر اسلامی جمہوریت

ایک خاتون نے بڑی معصومیت سے پوچھا: ''موجودہ جمہوریت کیسے اسلامی ہوگئی؟''

میں نے الٹا اُن سے سوال کر دیا: ''آپ سے کس نے کہا موجودہ جمہوریت اسلامی ہے؟ ہمارے جن علماء اور دانش وروں نے اسلامی جمہوریت کی اصطلاح استعمال کی ہے اُن کی مراد یہ ہے کہ مغرب کے نظام جمہوریت کا فلسفہ اور اقدار حیات اسلام کے منافی ہیں مگر اس کا منہج اور طرزِ حکومت اسلامی شوریٰ سے قریب تر ہے اور قابل اختیار ہے۔ میں نے علمائے ہندوپاک کے سیاسی افکار پر کام کیا

ہے۔ یہ بحث میری کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے: ''جبر و جمہوریت اور سید مودودی'' القلم پبلی کیشنز، بارہ مولہ کشمیر، ۲۰۲۱ء، صفحات ۲۸۸۔

اس کتاب میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ، سر سید احمد خاںؒ، حمید الدین فراہیؒ، حسین احمد مدنیؒ، محمد اقبال، ابوالکلام آزاد، حکیم حیدر زماں صدیقی، سید سلیمان ندوی، محمد میاں منصور انصاریؒ، محمد ادریس کاندھلویؒ، قاری محمد طیب قاسمیؒ، حامد الانصاری غازیؒ اور محمد اسحاق سندیلویؒ کے سیاسی افکار پر ۱۴۴ صفحات میں تجزیہ ہے جبکہ بقیہ صفحات میں سید مودودیؒ کی فکر سیاسی کا مطالعہ ہے۔

ایک طالبہ نے سوال کیا: ''مطالعہ کا صحیح طریقہ کیا ہے؟''

مطالعہ اپنے موضوع کے مالہ و ماعلیہ کا ہونا چاہیے۔ مطالعہ میں انارکی، نظم شکنی، انتخابی طریقہ نامناسب ہے۔ وقت محدود ہے۔ کتابوں کا انبار ہے۔ ای ریڈنگ کا وسیع جنگل ہے۔ غیر منضبط خواندگی انسان کو حیران و مضطرب کر دیتی ہے۔ ضروری ہے کہ خواندگی کا عمل منظم اور منضبط ہو۔ اپنے موضوع کے جوانب کا گہرا مطالعہ ہو۔

مطالعہ کا اختصار بنانا ضروری ہے۔ وہ مستقبل میں کام آتے ہیں۔ یہ اختصار یہ زندگی بھر رہنمائی کرتا ہے۔ قلم مضمون لکھنے کے لیے اُسی وقت اٹھائیں جب آپ کا وسیع الاطراف مطالعہ ذہن سے نکلنے کے لیے بیتاب ہو۔ لکھنے سے پہلے خاکہ بنائیں۔ اندازے سے ذیلی موضوعات متعین کریں جن میں تبدیلی کی گنجائش باقی رہے۔

مکالمہ یہ درسِ خاک بازی

آج عشائیہ کے لیے ڈائننگ کلب مہمان خانہ کا رخ کیا تو ذمہ داران نے بتایا کہ اسلامی جمعیت طلبہ ملتان کے رہنما ملاقات کے لیے بہت دیر سے منتظر ہیں۔ ہم نے انھیں آپ کی قیام گاہ پر جانے سے روکا تھا کہ آرام میں خلل نہ ہو۔

ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور میں ۲۴ر نومبر ۲۰۲۲ء کو منعقد ہونے والے مذاکرہ کی تصویریں سوال و جواب اور خطاب یوٹیوب پر نشر ہو چکا تھا۔ طلبہ اور نوجوان اب مشتاقِ دید تھے اور منتظر ملاقات۔ مجھے بھی نئی نسلوں کو پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملا تھا جو غنیمت تھا۔

سوالات متوقع تھے۔ میں ذہنی وفکری طور سے تیار تھا۔ ذرائع ابلاغ کی مفلسی اور دولت مند طبقہ کی اُن پر اجارہ داری دونوں ملکوں میں ترقی ابلاغیات کی فتنہ سامانی اور عوام کو مسحور رکھنے کے اُن کے ہتھکنڈے، ہندوستان میں جمہوریت کا استحکام، عام طور پر عدلیہ کا موثر اور منصفانہ کردار، بائیں بازو کے دانش وروں اور سماجی کارکنوں کی مزاحمت اور سزائیں وغیرہ موضوعات زیرِ بحث آئے۔

پرواز سے محروم شاہین

۷، ۸؍دسمبر ۲۰۲۲ء میں بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبہ علوم اسلامیہ اور اسلامک ریسرچ کی بین الاقوامی کانفرنس تھی۔ یہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے تعاون اور اشتراک سے منعقد ہوئی تھی۔ ماضی کی طرح اِس بار بھی پروفیسر ڈاکٹر محمد ضیاء الحق ڈائرکٹر جنرل نے دست تعاون دراز کیا تھا اور اہلِ علم وادب کا کارواں لے کر شریک اجلاس تھے۔ کانفرنس کا موضوع تھا: Modern Trends and Challenges in Muslim Thought (مسلم فکر میں جدید رجحانات وتحدّیات)

افتتاحی تقریب میں پروفیسر عبدالقدوس صہیب نے مہمانوں کا استقبال کیا اور پروفیسر محمد ضیاء الحق نے کانفرنس کے اغراض ومقاصد بیان کیے۔ مہمان مقرر احسن اقبال چودھری، فیڈرل منسٹر منصوبہ بندی وترقی حسب معمول تشریف نہ لا سکے۔ کہ کابینہ وزیروں کی ٹیلی ویژن پر زیارت اچھی لگتی ہے اور وہی ان کا مطمحِ نظر بھی ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنے کو اقبال کا شاہین سمجھتے ہیں۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

البتہ آج کے شاہین پرواز سے محروم ہیں اور ہوائی جہازوں اور ہیلی کاپٹروں کا محتاج۔ وفاقی وزیر کا ہیلی کاپٹر اسلام آباد سے پرواز نہ کر سکا کہ موسم سازگار نہ تھا۔ کسی آرام دہ گاڑی سے رات بھر کا سفر وہ کیوں کرتے کہ یہاں کوئی انتخابی جلسہ نہ تھا۔ اہلِ علم کی محفل تھی جو حکومت کی بے ڈھنگی رفتار کے ناقد ہی ہوتے ہیں۔

البتہ پروفیسر ڈاکٹر منصور اکبر کُندی پہلے کی طرح آج بھی شاداں وفرحاں تھے۔ شیخ الجامعہ

بہاءالدین زکریا یونیورسٹی بلاشبہ مصروف تھے مگر انھیں احساس تھا کہ یہ مصروفیت علم وفضل ہی کی دین ہے اور آج علم وادب کی کہکشاں انھیں ضیابار کرتی ہے۔ وہ پورا وقت نہ دے سکے مگر سارے مہمان کو شیلڈ تقسیم کر کے اور اُن کی اجازت لے کر گئے۔ میں نے انھیں ہمیشہ فرحت بخش، دل نواز اور علم وادب کا شیدائی پایا:

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

حرفی تعبیر کے مہلک اثرات

کلیدی خطبہ میرے ذمہ تھا۔ انگریزی زبان میں خطاب کی طرح ڈالی جا چکی تھی۔ مجھے اس روایت کو مستحکم کرنے میں تکلف نہ تھا۔ میرے نزدیک فکر اسلامی کی راہ کا سب سے بڑا حجاب حرفی تعبیر مذہب تھا۔ اسی کے بطن سے تاویلات فاسدہ نے جنم لیا۔ چنانچہ میں نے اپنی گفتگو کو عنوان دیا: Literalist Interpretations of Islam میں نے آغاز ہی میں وضاحت کر دی کہ مغرب میں حرفی تصور مذہب کے پس منظر کا جمود ورکود اور عیسائی پادریوں کا خلافِ عقل وترقی فہم تھا۔ اسلامی تاریخ میں حرفی تعبیرات کے بڑے مستند عالم ابن حزم ظاہریؒ (۱۰۶۳-۹۹۴ء) سمجھے جاتے ہیں مگر اُن کی لفظی تعبیرات فرقہ باطنیہ کے خلافِ شرع استدلال اور معانی کے خلاف ردّعمل ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں بے جا تاویلات کا راستہ مسدود کیا اور اُن کے گمراہ کن عقائد پر ضرب لگائی۔

ڈاکٹر فاطمہ اسماعیل مصری کی رائے میں نے نقل کی۔ امام ابن حزمؒ نے عقلیات اسلام کی تفہیم اور ادیان ومذاہب کے مطالعہ میں عقل کے کردار کو تسلیم کیا ہے۔ اُن کے ہاں عقل ونقل اور حرف ومعنی میں یک گونہ تطابق موجودہ ہے۔

دورِ جدید میں حرفی تعبیر مذہب نے فتنوں کا دروازہ کھولا۔ اسلام میں جبر واستبداد کے چور دروازے کھولے گئے۔ سفاک اور ظالم حکمرانوں کی حمایت کی گئی۔ تکفیر وتشدد کے فتنوں نے سر اٹھایا اور آج داعش، القاعدہ، بوکوحرام اور طالبان کے حرفی فہم مذہب سے اسلام بھی بدنام ہو رہا ہے اور مسلمانِ عالم بھی۔

میں نے کنز العمّال جلد۴،ص:۱۷۶ سے یہ حدیث بھی پیش کی۔رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یحمل ھٰذا العلمَ من کلّ خلفٍ عدولُه یُنفون عنه تحریفَ الغالین و انتحالَ المبطلین و تاویل الجاھلینَ.

ہر نسل کے عدل پسند اور منصف مزاج اِس علم کے حامل ہوں گے۔ وہ انتہا پسندوں کی تحریف کی تردید کریں گے، غلط کاروں کے خود ساختہ انتسابات مذہب کو مٹائیں گے اور جاہلوں کی تاویلات کو چھانٹ کر الگ کر دیں گے۔

پھر میں نے تیس منٹ کے اندر اِن تینوں نکات کو فکر اسلامی کے حجاب کی حیثیت میں واضح کیا:

(۱) **تحریف الغالین** یعنی انتہا پسندی پر مبنی تحریفات

(۲) **انتحال المبطلین** یعنی مذہب میں داخل کردہ غلط تصورات

(۳) **تاویل الجاھلین** یعنی جہالت و جاہلیت پر مبنی تاویلات

حدیث نبوی کی اصطلاح میں تحریف، انتحال اور تاویل کے یہ مناہج فکر و عمل جہالت کی کار فرمائی کا شاخسانہ ہیں۔ان مناہج کی علمی، فکری اور عملی تردید اور فکر اسلامی کی تنقیح کو اصلاح و تجدید سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مجدد اور متجدد کی درجہ بندی

دوپہر کو تین متوازی اجلاس عمل کا آغاز ساڑھے بارہ بجے سے شروع ہوا، اور ۲ بجے اختتام کو پہنچا۔اجلاس عمل کا آغاز آئی ایم ایس اکزیکٹیو ہال ہی میں میری صدارت میں ہوا۔مہمان اعزازی ڈاکٹر ہرمن رابروگ اور مہمان خطیب ڈاکٹر عبدالحمید بریسیک ڈائس پر موجود نہ تھے۔ڈاکٹر فریدہ یوسف نے نظامت کی ذمہ داری پوری کی۔

سات مقالات کی خواندگی ہوئی۔ ڈاکٹر خالد عبدالرزاق نے عربی میں اپنا مقالہ پڑھا۔ موضوع تھا: **خطر الإلحاد علی العالم الاسلامی و کیفیة مواجھته.**

ڈاکٹر عاصم نعیم، ڈاکٹر سعید احمد سعیدی اور عمر یوسف (مشترک) اور ڈاکٹر ارم سلطانہ اور ڈاکٹر

عائشہ جدون (مشترک) نے اردو زبان میں بالترتیب اپنے مقالے پڑھے:

۱۔ فکرِ اسلامی کو درپیش سائنسی تحدیات

۲۔ فقہ اسلامی میں اجتہاد کا تصور۔ برصغیر کے تناظر میں
روایتی اور متجد دمفکرین کی آراء کا تجزیاتی مطالعہ

۳۔ حقوقِ نسواں کو درپیش جدید چیلنجز کا حل: سیرتِ طیبہ کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ

تین مقالات انگریزی زبان میں پیش ہوئے:

1. Prevention of Westophobia in Muslim Societies: Challenges and Opportunities by Dr. Muhammad Riaz Mahmood and Hafiz Muhammad Hammad
2. The Shariah Compliance of Non- Interest Banking and Contemporary Challenges: A critical Analysis, by Hafiz Abdul Basit Khan.
3. The Emergence of Islamic Intellectualism in the Context of Modernity by Dr. Muhammad Atif Aslam Rao and Muhammad Akhtar

یہ عجیب مصیبت ہے۔ مقالہ ایک ہے اور اس کے مصنف متعدد ہیں۔ سائنس اور انجینئرنگ میں اس سے بڑا فتنہ سپروائزر کا طنطنہ اور دبدبہ ہے۔ طالب علم اپنی کاوش پر سینئر استاد کا نام نہ لکھے تو کسی معتمدبہ جرنل میں اس کی اشاعت کی نوبت ہی نہ آئے۔ کمال یہ ہے کہ دین دار طبقہ بھی اس بددیانتی پر کوئی کرب محسوس نہیں کرتا۔

سماجی علوم میں تو تجارت کی گرم بازاری ہے۔ پی ایچ ڈی مقالہ جمع ہونے کے لیے ناگزیر شرط تھی معتبر جرائد میں مقالات کی طباعت۔ اس کا استحصال کر رہے تھے جرائد کے مدیران۔ شکر ہے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن حکومت ہند کو اس کا احساس ہوا اور اس نے یہ شرط ہٹا دی۔

مقالات کی خواندگی تکمیل کو پہنچی تو ساری بحث مجدد اور متجدد کی اصطلاح کے گرد گھومتی ہوئی رہ گئی۔ بڑے خوبصورت اور عصری موضوعات اٹھائے تھے مقالہ نگاروں نے۔ عالم اسلام میں الحاد کا تدارک، مسلمان معاشروں میں مغرب کا بڑھتا ہوا خوف، سائنس اور اسلامی فکر، اجتہاد کا تصور اور دائرہ

کار، غیر سودی بینکنگ اور معاشی الجھنیں، مسلم دانش وری اور جدت کاری، حقوق نسواں اور سیرت – مگر سوالات کے وقفہ میں یہ تمام مسائل نظر انداز ہو گئے۔ چنانچہ صدارتی کلمات میں مجھے بھی تجدید اور تجدد کی تفہیم پر تفصیل سے اظہار خیال کرنا پڑا۔

میں نے سامعین سے گزارش کی۔ وہ مجدد اور متجدد کی درجہ بندی پر زور نہ دیں۔ کون مجدد ہے اور کون متجدد اِس قسم کی زمرہ بندی (Labelling) سے بچیں اور فیصلہ تاریخ کے حوالے کر دیں۔ تاریخ بے رحم قاضی ہے کسی کے ساتھ کوئی رعایت اور مروت نہیں کرتی۔

اس زمرہ بندی سے علمی نقصان ہوتا ہے۔ مجدد کی ہر تحریر، ہر رائے اور ہر تنقید قابل اتباع بن جاتی ہے اور متجدد ہر معاملے میں واجب رد ہو جاتا ہے خواہ اس کا موقف کسی مسئلہ میں درست ہو۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ قولِ فیصل صرف اللہ کا کلام اور اس کے رسول کی حدیث ہے۔ بقیہ اس روئے زمین پر کوئی معصوم نہیں ہے۔

کار تجدید میں جدیدیت شامل ہے۔ حالات وزمانہ کا ادراک کیے بغیر اصلاح وتجدید کا عمل موثر نہیں ہوتا۔ مگر یہ تجدید دین کی ہوتی ہے، دین کے علم برداروں کے مفاد کے لیے ہوتی ہے۔ دین کے تئیں نصح وخیر خواہی کے تحت ہوتی ہے۔ تجدد میں دین کی عمارت ہی پر یلغار شروع ہو جاتی ہے۔ دین کے ماننے والوں کے مفادات پر ضرب لگتی ہے اور مغرب کی ساحری اور اُس کا مکر وکید طواف کرتا دکھائی دیتا ہے۔

۲۰۲۱ء کا عام الحزن

ڈاکٹر محمد فیروز الدین شاہ کھگہ، شعبہ اسلامی وعربی علوم، سرگودھا یونیورسٹی پاکستان سے ایک مدت سے مراسلت تھی وہ صدر شعبہ مقرر ہوئے تو ڈاکٹریٹ کے مقالات کی جانچ اور تجزیاتی رپورٹ کے لیے مجھ سے رجوع کیا۔ میں قدرے مذبذب تھا کہ مزید ذمہ داری لینے سے منع کر دوں۔ سرگودھا یونیورسٹی کے دفتر امتحانات کی بے حسی اور بے رحمی کا تلخ تجربہ تھا۔ محترمہ صائمہ غفار معاون کنٹرولر کا دفتر نا اہل بھی تھا اور خود غرض بھی۔ پی ایچ ڈی رپورٹ جمع ہونے کے بعد کسی مراسلت کا جواب دینا کسر شان سمجھتا تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف ظفرؒ کے انتقال کے بعد شعبہ عربی واسلامی علوم کی یتیمی اور لاچاری

بھی بڑھ گئی تھی۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بعض بزرگ ممتحنین نے اسی لیے وہاں سے کوئی راہ ورسم باقی رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔

ڈاکٹر محمد فیروز الدین شاہ کھگہ صدر شعبہ مقرر ہوئے اور دفتر امتحانات کی تمام تر تساہلی کا کفارہ ادا کرنے کا عندیہ دیا۔ پی ایچ ڈی رپورٹ کو محض اکرامیہ کی خاطر روکے رکھنا ویسے بھی اساتذہ کے وقار کے خلاف ہے۔طلبہ تو بے قصور ہیں۔ مدتوں کی محنت کا ثمر انھیں وقت پر ملنا چاہیے۔ میں نے صدر شعبہ کو کورونا میں مبتلا ہونے اور اپنے والد الحاج عبارت حسین خاں کو ۱۳/اپریل ۲۰۲۱ء میں برادر اصغر پروفیسر احسان اللہ فہد فلاحی شعبہ دینیات سنی، ویمنس کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ۲۱/اپریل ۲۰۲۱ء میں اور دوسرے برادر اصغر ڈاکٹر امان اللہ فہد فلاحی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اسکول نئی دہلی کو ۲۲/اپریل ۲۰۲۱ء میں کھونے کا غم برداشت کرنے اور اُس سال کو اپنے حق میں عام الحزن تصور کرنے کے باوجود تسلی دی اور رپورٹ بھیجنے کا وعدہ کیا۔

صدر شعبہ نے اثبات میں جواب ملتے ہی سات مقالاتِ ڈاکٹریٹ ایک ساتھ ممتحن کے لیے بھجوا دیے۔ جیسے انھیں تعمیل حکم کا مکمل یقین تھا۔

ڈاکٹر کھگہ کی علم نوازی

ڈاکٹر محمد فیروز الدین شاہ کھگہ سے کوئی ملاقات پیش تر ہوئی ہو، مجھے یاد نہیں۔ لاہور میں اقامت کے دوران ڈاکٹر سیف اللہ فیضی اور ڈاکٹر منیر احمد رسول پوری جیسے دم ساز احباب نے اُن کی شرافت اور معقولیت کی گواہی دی گو بعض لوگ اُن کے بارے میں نامناسب رائے رکھتے ہیں۔

فرشتے قسم کھائیں جن کی پاک بازی کی
وہ تیرے شہر میں رسوا دکھائی دیتا ہے

اور بعد میں اندازہ ہوا کہ صدر شعبہ کو رسوائی مول لینی پڑتی ہے۔ عام طور سے دفتر رجسٹرار کی نااہلی کی وجہ سے۔ پروفیسر عبدالقدوس صہیب نے بھی عندیہ دیا تھا کہ وہ شریف النفس شخص ہیں۔ ملتان کانفرنس میں تشریف لا رہے ہیں۔ آپ کی اُن سے ملاقات ضرور ہوگی۔ عشائیہ کے بعد آج میں اُن سے ملاقات کی منصوبہ بندی کر ہی رہا تھا کہ انھوں نے اپنے احباب کے ساتھ دروازے پر دستک دی۔

وہ تپاک سے ملے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔انھوں نے اپنے موبائل میں میری ملاقات کی ایک تصویر بھی دکھائی۔ میں حیران تھا۔ایک انتہائی نجیب ومتین شخص میرے حافظے سے کیسے محو ہوگیا۔انھوں نے سب سے پہلے معذرت پیش کی اپنی دانش گاہ کے دفاتر امتحانات ومالیات کی طرف سے اور پھر بعض قانونی پیچیدگیوں کی وضاحت کی مگر ساتھ میں یقین بھی دلایا کہ تلافی مافات ہوگی۔ اکرام وعطا کا معاملہ ہوگا۔آپ ہماری یونیورسٹی کے بھی مہمان ہوں گے۔صدارت شعبہ تبدیل ہوگئی ہے مگر آپ کی ضیافت اور تکریم میں کوئی کمی نہ ہوگی۔صدر شعبہ ڈاکٹر فرحت نسیم علوی شریف خاتون ہیں اور معاملہ فہم بھی۔

ڈاکٹر کھگہ جاتے جاتے دو کتابیں ہدیہ کر گئے:(۱) خاتم النبیین قاطع قادیانیت، از مصباح الدینؒ، طبع رابع ستمبر ۲۰۲۲ء، صفحات ۵۱۰ (۲) مطالعۂ اسلام اور استشراقی تنقیدات، ڈاکٹر محمد فیروز الدین شاہ کھگہ، عکس پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۹ء، صفحات ۲۶۸۔

سیاساتِ اسلام کی منہاجیات

۸؍دسمبر ۲۰۲۲ء کو اولین اجلاس عمل میں مجھے گفتگو کرنی تھی۔صدارت پروفیسر محمد اکرم چودھری کر رہے تھے اور مہمان اعزازی تھے پروفیسر محمد حماد لکھوی۔اجلاس کی نظامت ڈاکٹر قاریہ نسرین اختر کر رہی تھیں۔

دورِ جدید میں اسلامی تاریخ میں فکر سیاسی کی میراث پر جو کام ہوا ہے اس میں کیا منہجی خامیاں موجود ہیں جن کی وجہ سے سیاساتِ اسلام کو وہ رسوخ، استحکام اور عوامی مقبولیت نہ مل سکی جو معاشیاتِ اسلام کے حصہ میں آئی۔آج میں نے ان مسائل کو سمیٹنے کی کوشش کی۔زبان انگریزی تھی اور سامعین با ذوق اصحاب علم تھے۔میں نے درج ذیل نکات پیش نظر رکھے۔

۱۔ سیاسی مفکرین پر کام کرنے والے مغربی مصنفین نے سیاساتِ عالم کو مغرب ہی کی عینک سے دیکھا اور سمجھا ہے۔انھوں نے فارس، چین، ہندوستان، ماوراء النہر کے علاقوں اور مصری فراعین کی علمی خدمات کے ساتھ اسلام کی ہزار سالہ تہذیب کو بھی نظر انداز کیا ہے۔

۲۔ مغرب نے یوروپ اور عیسائیت کے تناظر کو تاریخ اسلام کے سیاسی فکر پر جبراً منطبق کیا

ہے۔ اسلام کی تاریخ اُس خونی کشمکش سے خالی ہے جو عیسائیت کا امتیاز ہے۔ تعقل وتدبر پر اسلام نے کبھی بندش نہیں لگائی کہ اس کے ردِعمل میں سیکولرزم کی تحریک اٹھتیں۔

۳۔ مغربی مصنفین نے فکر سیاسی کا مرجع ومنبع یونانی ضمیات کو قرار دیا اور اس کے نتیجے میں اُن ہی افکار سے انھوں نے بحث کی جو یونانی علمیات سے ہم آہنگ تھے۔ اُس سے باہر کی خدمات، افکار اور تناظرات مطالعۂ سیاست سے خارج کر دیے گئے۔

۴۔ اعلیٰ درجے کے سیاسی مفکرین کی عبقری خدمات پر توجہ صرف کی گئی مگر اسلامی تہذیب کی میراث کے تسلسل کو نظر انداز کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں اسلامی معاشرہ کی بوقلمونی، سماجی استحکام اور سیاسی وحدت کے اصل مآخذ قرآن وحدیث پر ان کی نگاہ نہ گئی۔

اس اجلاس عمل میں ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب، پروفیسر ڈاکٹر منیر احمد خاں، ڈاکٹر محمد مسلم، ڈاکٹر ظفر اقبال خاں اور رستم خاں نے بھی بڑے اہم موضوعات پر اظہارِ خیال کیا۔ وقت کی قلت کی وجہ سے پانچ مقالات خواندگی سے رہ گئے۔

ڈاکٹر صہیب نے فکر سیاسی کی تشکیل جدید پر زور دیا اور اُن اسباب کا سراغ لگانے کی کوشش کی جن کی وجہ سے اسلامی عمرانیات کو تاریخ میں پذیرائی نہ مل سکی۔ ابنِ خلدون کے بعد اسلامی تاریخ میں کوئی اعلیٰ عمرانی مفکر نہ پیدا ہو سکا نہ اسلامی عمرانیات پر کسی نے کوئی اعلیٰ تحقیق پیش کی۔

ڈاکٹر ہرمن رابرگ کی گل افشانی

جرمن اسکالر ڈاکٹر ہرمن رابرگ سے ملاقات اس کانفرنس کے حاصلات میں سے ہے۔ وہ اس وقت اسکول آف ریلیجین اینڈ فلاسفی، منہاج یونیورسٹی لاہور میں وزٹنگ پروفیسر ہیں۔ کانفرنس کی افتتاحی تقریب کے بعد چائے کی میز پر اُن سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور اس کے شعبہ علوم اسلامیہ کے نامور استاد پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کا تذکرہ بڑی عقیدت ومحبت سے کیا تو میں اُن کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر رابرگ نے معانقہ کیا اور اُن کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں نے برجستہ پوچھا:

Are your Herman Roborgh who was pursuing

Ph. D. under the supervision of Professor Siddiqui few years back?

انھوں نے اپنائیت سے چمٹالیااور بولے:

O my God! Have you remembered me? I can not forget my stay at Aligargh. It was the most cultured and civilized as well as disciplined place of learning I have ever visited in my life.

انھوں نے اسلام آباد میں رہ کے اتنی اردو سیکھی کہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی مایہ ناز تفسیر تدبرِ قرآن پر پی ایچ ڈی مکمل کی۔ وہ نظم وضبط کے اتنے پابند تھے کہ اپنے سپروائزر پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی سے ایک روز قبل باہمی تبادلہ خیال کے لیے وقت لیتے۔ اور ملاقات سے ٹھیک آدھا گھنٹہ پہلے شعبہ پہنچ جاتے۔ کوریڈور میں ٹہلتے اور نگاہ گھڑی پر رہتی۔ وقت ہوا نہیں کہ انھوں نے استادمحترم کے کمرے پر دستک دی۔ ڈاکٹر صدیقی خوش دلی سے مرحبا کہتے۔ پہلے دونوں چائے پیتے پھر ریسرچ پر گفتگو ہوتی۔

ڈاکٹر صدیقی نے مجھے ایک بار بتایا کہ ڈاکٹر رابرگ نے کبھی تاخیر نہ کی۔ اُن کا معمول تھا۔ گفتگو کے تمام نکات اپنی ڈائری میں رقم کرتے۔ پھر اگلی ملاقات میں اپنے سپروائزر سے تصدیق کرتے کہ مبادا اُن کا مدّعا سمجھنے میں غلطی ہوگئی ہو اور ضرورت پڑتی تو تصحیح بھی کرتے۔

کانفرنس کی اختتامی تقریب میں ڈائس پر میرے بغل میں اُن کی نشست تھی۔ وہ ہر مقرر پر برمحل تبصرے کرتے اور مسکراتے۔ پروفیسر محمد حمّاد لکھوی کی تقریر پر ذومعنی تبصرہ کیا:

He is a polulist speakers.

میں نے وضاحت چاہی:

You mean he is not an intellectual.

پھر ذومعنی تبصرہ کیا:

Good joke! The Aligarians are intellectual.

اب بھی وہ پُراسرار ہی رہے۔ جرمن واقعی بہت گہرے ہوتے ہیں۔ اُن کا مدّعا سمجھنا آسان نہیں ہوتا۔

پُراسرار ظفر اقبال

شعبہ علوم اسلامیہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کے قدیم اساتذہ سے اِس بار راز ونیاز نہ ہوسکا۔ پروفیسر سلطان محمود کھوکھر کی زندہ دلی، ڈاکٹر الطاف حسین لنگڑیاں کی نغمہ ریزی، پروفیسر محمد ادریس لودھی کی متصوفانہ مشاورت، استاذ الاساتذہ پروفیسر کا حلم اور تواضع: ان سب سے محرومی رہی۔ ملازمت سے سبک دوشی عام طور سے انسان کو معتکف مزاج بنا دیتی ہے۔ بڑے فعال اور قد آور لوگ بھی زہد اور مردم بیزاری کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔

اس بار ایک نئی شخصیت سے تعارف ہوا۔ ڈاکٹر ظفر اقبال سعیدی عام طور پر خاموش طبع اور پُراسرار نظر آئے۔ روٹھے روٹھے، اکھڑے اکھڑے سے۔ جیسے دنیا سے بے نیاز اپنی شخصیت میں گم مگر اپنی دنیا آپ بنانے والے۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
روحِ آدم ہے ضمیر کُن فگاں ہے زندگی

۹ر دسمبر ۲۰۲۲ء کے چوتھے متوازی اجلاس عمل کے ناظم کی حیثیت میں آئی ایم ایس ایکزیکٹو ہال میں ڈاکٹر ظفر اقبال سعیدی نے اردو اور انگریزی میں اتنی گل افشانی کی کہ طبیعت مکدّر ہونے لگی۔ ہر مقالہ نگار کو دعوت خطاب دیتے وقت اور اس کی خواندگی مکمل ہونے کے بعد بھی ان کی گہر باری جاری رہتی جیسے ڈائس پر بیٹھنے کے شوقین موقع ملتے ہی سامعین کو اتنا گراں بار اور اُن کی سماعتوں کو اس قدر ثقیل کر دیتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ آدمی صُمٌّ بُکمٌ عُمیٌ بن کر رہ جائے اور لَا یَفْقَھُوْنَ کا مصداق بن جائے۔

مگر جب اختتامی تقریب میں نغمہ سرا ہوئے تو شخصیت ہی بدل گئی۔ ایسا ترنّم، ایسی پُرسوز آواز جیسے کلام اقبال کے حافظ ہی نہیں اُس کے بہترین شارح بھی ہیں۔ ایسا محسوس ہوا، اُن کے قلب پر کلام اقبال کا نزول ہو رہا ہے اور اُن کی زبان لحن داؤدی کا ساتھ دے رہی ہے۔

لوح بھی تُو، قلم بھی تُو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عالم آب وخاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تُو نے طلوع آفتاب

اور جب انھوں نے یہ اشعار پڑھے تو میرا جسم لرزنے لگا۔ آنکھیں تر ہوگئیں۔ اور اعضاء وجوارح کیف وسرور سے جھومنے لگے:

شوکتِ سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود
فقر جنید و بایزید، تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب

مجھے سخت شرمندگی ہوئی یہ ظفر اقبال سعیدی تو شاید عربی وفارسی سے آشنا نکلے۔ اقبال کے محرم راز بھی اور دانائے راز بھی۔ ان سے بے تکلفی کی سعادت مجھے کیوں حاصل نہ ہوسکی۔ کس قدر حلاوت اور لذت سے انھوں نے بند مکمل کیا تھا۔

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل، غیاب وجستجو! عشق، حضور و اضطراب

سرسید کو ٹیلی فون

اختتامی تقریب کے مہمان مقرر پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی، ڈین فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز، پنجاب یونیورسٹی لاہور تھے۔ انھوں نے اپنی گفتگو مرکوز کی 'حقوق العباد' کے مرکزی خیال پر۔ اسلام انسانی حقوق کا نہیں، حقوق العباد کا تصور دیتا ہے۔ سارے انسان اللہ کے بندے ہیں۔ عبدیت کا عقیدہ جاں گزیں ہوجائے تو دنیا جنت کا نمونہ بن جائے۔ اسلام کا آغاز اسی عبدیت سے ہوتا ہے اور عروج وکمالِ انسانی بھی یہی عبدیت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر معراج سائنس وٹکنالوجی کا منتہائے کمال ہے۔ روحانیت کا عروج آخریں ہے مگر قرآن جب اس لاثانی سفر کا تذکرہ کرتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کے عبد کا خطاب دیتا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل کی ابتدا اسی آیت سے ہوتی ہے:

سُبْحَانَ الَّذِیْ أَسْرَی بِعَبْدِهِ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَی الْمَسْجِدِ الأَقْصَی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَهُ لِنُرِیَهُ مِنْ آیَاتِنَا إِنَّهُ هُوَ السَّمِیْعُ البَصِیْرُ. (بنی اسرائیل:۱)

پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجدِ حرام سے دور کی اُس مسجد تک جس کے ماحول کو اُس نے برکت دی ہے تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ حقیقت میں وہی ہے سب کچھ سننے اور دیکھنے والا۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد رمضان، وائس چانسلر، ایمرسن یونیورسٹی ملتان مہمان خصوصی تھے۔ اُن کی تاکید تھی نئی نسل کے تئیں ہمیں اپنا تناظر بدلنے کی ضرورت ہے۔ اُن کے اندر صلاحیت کا جوہر ہے اُسے صیقل کرنا ضروری ہے۔ اُن کا وژن وسیع ہے اور گہرا بھی۔ وہ اساتذہ کو نصیحت کرتے اور طلبہ وطالبات پُر جوش ہو کر تالیاں بجاتے۔ ڈاکٹر ہرمن رابرگ لطیفہ گوئی کرتے کہ یہ سیاسی لیڈر ہے:

Do not underestimate your students

ڈاکٹر محمد اکرم چوہدھری سابق وائس چانسلر سرگودھا یونیورسٹی صاحب علم شخصیت ہیں۔ ماسٹر اور پی ایچ ڈی عربی میں مکمل کی ہے۔ انھوں نے تصویر کا دوسرا رخ دکھایا۔ کسی بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد ہونا تھا۔ مقالہ نگاروں کو کچھ سرکاری معلومات فراہم کرنا ضروری تھا۔ نوجوان ملازم رابطہ کار نے فہرست بنائی۔ اُس میں دو نام ایسے تھے جن سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا: (۱) حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۲) سرسید احمد خاںؒ۔ ملازم نے صدر شعبہ سے رابطہ کیا۔ وہ مسکرا کر بولے:

اُن کا قیام ایسی جگہ ہے جہاں نیٹ ورک کی سہولت نہیں ہے۔ فون کام نہیں کرتا۔

ملازم نے عاجزی سے کہا:

سر، اُن کا وہاٹس ایپ نمبر دے دیجیے۔ میں لوکیشن ٹریس کرلوں گا۔

اور محفل کے ساتھ مہمان خصوصی بھی قہقہہ لگا رہے تھے نئی نسل کی بے خبری پر۔ ڈاکٹر ہرمن رابرگ نے برجستہ تبصرہ کیا: یہ محض لطیفہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں ڈاکٹر محمد اکرم چودھری بہت باتونی ہیں۔ وہ خود لطیفے بناتے ہیں زیب داستاں کے لیے۔ بعد میں کسی ریسرچ اسکالر نے بھی اِسی قسم کا تبصرہ کیا تو

مجھے سنجیدہ ہونا پڑا۔

رئیس الجامعہ نہیں، مسکین الجامعہ

اختتامی تقریب میں ڈاکٹر محمد ضیاء الحق نے قرار دادیں پڑھ کر سنائیں اور ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب نے کلماتِ تشکر ادا کیے۔ نظامت پروفیسر الطاف حسین لنگریال کر رہے تھے اور مشک باری کر رہے تھے۔ حسن اتفاق شیخ الجامعہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی پروفیسر ڈاکٹر منصور اکبر کندی آج بھی رونق افروز تھے۔ صدارت کے لیے وہ معذرت خواہ تھے کہ مقالہ نگاروں کو نہ سن سکے منصبی مصروفیات کی وجہ سے۔

شیخ الجامعہ کہنے لگے:

> لوگ کہتے ہیں وائس چانسلر رئیس الجامعہ ہوتا ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے وہ مسکین الجامعہ ہوتا ہے، قابل رحم اور مجبور۔ اپنی مرضی کا مالک نہیں ہوتا۔ اُس کی اپنی ترجیحات نہیں ہوتیں۔ اپنی پسند اور ناپسند پر بھی اُسے اختیار نہیں رہتا۔ وہ جامعہ کے مفادات و معمولات کا غلام ہوتا ہے اور بس۔

عجیب بات ہے۔ کیسے نادر تجربات ہیں! یہ تجربات شاید آفاقی نوعیت کے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شعبہ اسلامک اسٹڈیز نے بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی۔ ترکی کے صوفی اسکالر شیخ بدیع الزماں سعید نورسی (۱۹۶۰-۱۸۷۳ء) کے افکار کی عصری معنویت کو اجاگر کرنے کے لیے موضوع تھا:

"Risala-i-Nur Knowledge, Faith, Morality and Future of Humanity"

بعد میں اس کی مفصل روداد شائع ہوئی:

Faith- knowledge perspective of Said Nursi (Selected papers presented in the 3rd International Nursi Studies Conference in India organized by the department of Islamic Studies, Aligrgh Muslim University in collaboration

with the Istambul Foundation for Science and Culture, Turkey on February 11-13, 2014 at Aligargh) *Edited by: Dr. Obaidullah Fahad, Publication division, Aligargh Muslim University, 2016, 439 pp.*

کانفرنس کی تیاریوں کے سلسلے میں نائب شیخ الجامعہ سید احمد علی بریگیڈیر (ریٹائرڈ) سے رابطہ کیا۔انھوں نے بعد نماز عصر سرسید ہال اور جامع مسجد کے مغرب میں بنے کرکٹ اسٹڈیم میں مجھے طلب کرلیا۔ میں فائل لے کر اُن کی خدمت میں پہنچا۔ وہ کرکٹ میچ سے محظوظ ہورہے تھے۔ میں نے بے تکلفی سے عرض کیا:

سر آپ تو انجوائے کررہے ہیں۔اس وقت علمی گفتگو مناسب رہے گی؟

بولے:

The word enjoyment is applied when you have option. Being a P.V.C. I have no option.

اختتامی تقریب تکمیل کو پہنچی تو پرانے کرم فرما ڈاکٹر اقبال خاں یوسف زئی اپنی گاڑی کے ساتھ مہمان خانہ پہنچانے کے لیے حاضر تھے۔ ڈاکٹر منزّہ حیات ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اسلامک اسٹڈیز اور ہاؤس سپرنٹنڈنٹ مریم ہال بہاءالدین زکریا یونیورسٹی باہر سواری کی منتظر کھڑی تھیں۔ ڈاکٹر اقبال کی وہ استاد تھیں اور میری بھی حبیب۔انھیں گاڑی میں بٹھایا۔مریم گرلز ہال کے عین دروازے پر انھیں اتارا تو انھوں نے چائے کی دعوت دے ڈالی۔

وارڈن ہاؤس ہی میں ہم نے جمع بین الصلوٰتین کیا۔اُن کے دونوں بھانجوں سے اور چھوٹی بہن سے مزاج پرسی کی توفیق بھی مل گئی۔ شام کو وہ مہمان خانہ تشریف لائیں اپنے قیمتی تحائف کے ساتھ۔تحائف تو ڈاکٹر رضیہ شبانہ اور ڈاکٹر سائرہ طیبہ کے ہاتھوں میں بھی تھے وہ بھی خیریت طلبی کے بہانے حاضر ہوئیں اور ممنون کرگئیں۔ڈاکٹر اقبال خان نے تو حسبِ روایت محبت کی تمام حدیں پار کردیں۔ اپنی سوغاتوں کے ساتھ ایک بڑا بیگ بھی عنایت کیا کہ یہ سارے تحائف علی گڑھ تک پہنچ سکیں۔

صدر شعبہ علوم اسلامیہ ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب بین الاقوامی کانفرس سے پہلے ہی اپنے تحفوں سے نہال کر چکے تھے۔ مبادا مہمانوں کے ہجوم میں وہ بھول جائیں۔ انھوں نے اپنی عنایتوں میں اہلیہ کے ساتھ بڑے بیٹے مثنیٰ فہد کو بھی شریک کیا تھا۔

۲۰۲۱ء میں بعض تکنیکی کمیوں کی وجہ سے ملتان کا سفر ملتوی ہو گیا تھا۔ نئی دہلی طیران گاہ سے بے نیل ومرام میں واپس آ گیا تھا اور طرفہ تماشا یہ ہوا تھا کہ طرفین کے ہوائی ٹکٹ بھی منسوخ ہو گئے تھے۔ اٹھاون ہزار کا خسارہ میرا مقدر تھا مگر اب اِن سارے خساروں کی تلافی ہوگئی تھی۔ احباب نے اپنی عنایات کیں اور جیب و دامن تنگ ہو گئے۔ ملتان کا یہ چھٹا سفر علمی مباحث اور احباب کی محبتوں کے باعث یادگار بن گیا۔ ماضی کے پانچ اسفار شائع ہو چکے ہیں کتابی شکل میں ''مدینۃ الاولیاء کا سفر (سفر نامہ ملتان)'' پبلشر ڈیویژن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۲۰۲۳ء، صفحات ۱۹۹)

خواجہ غلام السدین *
ترجمہ: نثار احمد فاروقی **

اسلام امن وآشتی کا مذہب

مجھے عالمِ دین ہونے کا دعویٰ نہیں ہے، اس لیے عین ممکن ہے کہ میں اسلام کے پیغام کی ترجمانی کرتے ہوئے بعض امور میں عقیدے کی ڈگر سے ہٹ جاؤں۔ کہیں تو یہ فرق محض کچھ باتوں کو زیادہ اہمیت دینے نہ دینے کا ہوسکتا ہے اور کہیں کہیں مستقل بالذات بھی ہوگا۔ مجھے تعلیمات اسلامی کے بعض پہلوؤں کی ایسی تاویل دیکھنے کا اتفاق بھی ہوتا ہے جنھیں میں ذاتی طور پر قطعاً ناقابلِ قبول سمجھتا ہوں۔ میں یہ بھی نہیں مانتا کہ چوں کہ ایک رائے آج سے ہزار پانچ سو برس پہلے ظاہر کی جا چکی ہے لہٰذا محض اپنی قدامت کی بناء پر آج بھی وہ قابلِ احترام ہے۔ مثلاً میرا عقیدہ ہے کہ بہت سے دنیوی امور میں اسلام نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ اس نظریہ کے برخلاف بعض فقہاء[1] نے جو شرائط عائد کردی ہیں جن کی روشنی میں سیاسی اور سماجی معاملات میں مسلمان اپنی غیر مسلم (ذِمّی) رعایا کے ساتھ معاملہ کریں، ایسے نظریات انسانی مساوات کے بنیادی اصول کے خلاف ہیں، نہ صرف قرآن کے مجموعی انداز نظر سے ان کی تائید نہیں ہوتی، بلکہ یہ انسان دوستی کی روح

---

* ماہرِ تعلیم وسابق سکریٹری، وزارت تعلیم ہند
** سابق پروفیسر وصدر شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی (دہلی)

کے بھی منافی ہیں۔ جب کوئی شخص ایسی کسی تفسیر کے پایۂ استناد کو جانچنا چاہے تو اسے محض یہی نہیں دیکھنا چاہیے کہ جن لوگوں کے ذریعے یہ روایت منتقل ہوئی ہے وہ کہاں تک سچے اور قابلِ اعتبار تھے جیسا کہ اب تک ہمارے علماء کرتے آئے ہیں بلکہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ وہ روایت اس مذہب کے نظریات کے عام سماجی اور اخلاقی ڈھانچے سے مطابقت بھی رکھتی ہے یا نہیں۔ مثلاً قرآن کا بالکل واضح موقف ہے کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ وہ سلوک کیا جائے جو رواداری، فراخ دلی اور اُخوتِ انسانی کے اصول پر مبنی ہو۔ اب اس کے بعد اگر کوئی ایسی حدیث یا اس کی کوئی تاویل ملتی بھی ہے جو مذکورہ بالا تعلیم سے لفظاً و معناً مختلف ہو تو یہ نتیجہ نکالنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ زمانۂ مابعد میں حکمراں طبقے کے ان اعمال کا جواز پیدا کرنے کے لیے گڑھی گئی ہوگی جنھیں اور کسی طرح جائز قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

ایسے موضوع احادیث اور قرآنی آیات کی تفسیر بالرائے کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جنھیں علمائے سوء نے حاکمانِ وقت کو خوش کرنے کے لیے گڑھ لیا تھا۔ ایسے حالات میں مغز اور پوست میں فرق کرنا اُن افراد کی ذمہ داری ہو جاتی ہے جو باشعور ہیں اور صداقت کا احساس رکھتے ہیں اور یہ ایسا حق ہے جو کچھ قیود کے ساتھ اسلام نے ہر شخص کو دیا ہے۔ اسی کو ''حق اجتہاد'' کہتے ہیں۔ اس نے انسانی زندگی کے روحانی معاملات میں بھی اور مذہب سے علاقہ نہ رکھنے والے مسائل میں بھی، عقل کو ایک اہم مقام عطا کیا ہے۔ قرآن میں تعمق (فکر) اور وسعت نظر (ذکر) دونوں کی ضرورت پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ یہاں مختصراً اتنا اشارہ کافی ہوگا کیوں کہ تاریخ میں ایسے عوامل اور محرکات رہے ہیں کہ سیاسی، سماجی، اقتصادی، فلسفیانہ اور مذہبی طور پر جنھوں نے انسانی عقل کو کچلنے کی کوشش کی ہے، تاکہ وہ یا تو لوگوں کو خود غرض یا حکمرانِ وقت افراد کا آلۂ کار بنا سکیں اور اُن میں ''تن بہ تقدیر'' رہنے کا جذبہ پیدا کریں۔

مذاہب کی عموماً غلط تاویل ہوتی رہی ہے تاکہ اس عقیدے کو شہ ملتی رہے کہ انسان کی قسمت تو خدا نے پہلے سے بنادی ہے اور خدا جس حال میں اُسے چاہے رکھے بندے کو اس میں دم مارنے کی مجال نہیں ہے۔ انسان کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ایسے عقائد کے خلاف بار بار بغاوت کرتا رہا ہے جن کی تبلیغ مختلف ذرائع سے ہوتی رہی ہے اور اس طرح انسان نے اپنے آزادیٔ فکر کے ورثے میں آہستہ آہستہ اضافہ کیا ہے۔

مذہب اور اخلاقیات کے میدان میں انسان نے جو پیش رفت کی ہے اُس میں نہ صرف آزادیٔ فکر کا یہ سرمایہ اس کی پشت پر رہا ہے بلکہ یہ کرۂ ارضی پر انسانی زندگی کے رنگا رنگ پہلوؤں میں

سب سے زیادہ قیمتی اور قابلِ فخر متاع ہے۔

ہر مذہب میں یہ رجحان عام ہے کہ روایت پرست لوگ لفظ کو روح پر فوقیت دیتے ہیں اور رسوم وعقائد کو بنیادی اور حیات افروز اصولوں سے بالاتر رکھتے ہیں۔ لفظی تاویلات سے سرِ مو ہٹنا نہیں چاہتے، اور اس کی شرح میں بال کی کھال نکالتے رہتے ہیں۔ یہ کسی حد تک مذہبی رہنماؤں یعنی ملاؤں، پنڈتوں اور پادریوں کی رجعت پرستی کے باعث ہوسکتا ہے لیکن اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ لوگ نئی تحریکوں سے باخبر نہیں رہتے، فکر وخیال کے جدید تقاضوں اور انسانیت کے تازہ تر مسائل ومقتضیات سے غافل رہتے ہیں اور ان میں سے اکثر کی یہ کوشش بھی ہوتی ہے کہ عافیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور نئے افکار سے جو خطرات پیدا ہوسکتے ہیں اُن سے محفوظ رہیں۔

یہی سبب ہے کہ ہر مذہب میں ان لوگوں کی تعداد بہت مختصر ہے جو اپنے مذہب کے دائرے میں بند نہیں رہے ہوں اور انھوں نے حقِ اجتہاد کا استعمال کر کے نئے افکار بھی پیدا کیے ہوں۔ اس پر دوسرے مذہب والوں کی طرف سے تنقیدی تبصرے بھی ہوئے جو کبھی کبھی نامناسب حد تک سخت تھے اور یہ عموماً ناراضگی یا مناظرے بازی کی پیداوار تھے۔ روایت پرست ملاؤں کے سامنے دوسرا مقصد اپنے مفادات کا تحفظ اور عوام میں اپنے اثر ونفوذ کو باقی رکھنا تھا۔ اگر کسی مذہب کے پیرو یہ سمجھنے لگیں کہ انھیں مذہبی اُمور میں آزادئ فکر کا حق بھی حاصل ہے اور وہ ان مسائل کو اپنے طور پر سمجھنے میں اپنا دماغ کھپانے لگیں تو مذہب کی تفسیر وتعبیر پر ان روایت پرستوں کی اجارہ داری معرض خطر میں پڑ جاتی ہے۔ (اس ملک کے بعض دور افتادہ دیہی علاقوں میں تو آج بھی یہ ہوتا ہے کہ ملا جی سال چھے مہینے میں ایک بار وہاں آتے ہیں اور چھُری پر کلمہ دم کر کے اپنا نذرانہ لے جاتے ہیں، کلمہ پڑھنے یا سیکھنے کی کوشش کرنے کی بجائے گاؤں والے اسی ''پڑھی ہوئی'' چھُری سے ذبیحہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ انتہائی درجے کی مثال ہے مگر اس سے صورتِ حال کا اچھی طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ جب کسی مذہب میں اس طرح کا عمل در آمد ہونے لگے تو اس کا وہ توانا حصہ جس میں زندگی بخش عناصر اور حرکی قوت ہوتی ہے گھٹ کر چھوٹی چھوٹی غیر اہم اور ٹکی بندھی باتوں میں محدود ہو جاتا ہے۔ یہ تمام مذاہب کے لیے ایک زبردست انتباہ ہے اگر وہ خطرے کے اس نشان تک پہنچ جائیں!)

یہ بات بہر حال مشتبہ ہوسکتی ہے کہ میں اسلام کے پیغام کی بطورِ خود شرح کرنے کا اہل ہوں یا

نہیں، مگر میں سختی سے اس بات کا حامی ہوں کہ ہر سنجیدہ دیانت دار اور ذہین انسان کو ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس طرح کئی نئی تشریح و تعبیر ہر زمانے میں مختلف وجودہ سے ضروری بھی ہو جاتی ہے۔ جدید دنیا پر کم سے کم پچھلی دو صدیوں میں ایسے نئے نئے دباؤ پڑے ہیں اور اتنی سماجی، ذہنی اور تکنیکی تحریکیں پیدا ہوئی ہیں جنھوں نے انسانی زندگی کے پورے دھڑے ہی کو بدل دیا ہے۔ اب مذہب کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ عہدِ حاضر میں اپنے کردار اور دائرۂ عمل کا دوبارہ جائزہ لے اور اس کی نئی تعبیریں پیش کرے۔ اس کے لیے ہم آہنگی اور تطبیق کا رویہ اختیار کرنا ضروری ہے، جو نئے دور کی شئو یتوں کو نظر میں رکھے جو بڑی تیزی سے پیدا ہو رہی ہیں اور آج کے تضادات میں ایک واضح موقف بھی اپنا سکے۔ ایمان داری کی بات تو ہے کہ اب مذہب کو بسم اللہ کے گنبد میں بند نہیں ہونا چاہیے۔ یہ عذر نامناسب ہے کہ اس کا ان ارضی اور مادّی اُمور سے کچھ سروکار نہیں، اس کا مطمحِ نظر تو صرف آخرت سے ہے۔ اگر وہ اِس ''دوسری دنیا'' والے نظریے کو اختیار کرتا ہے تو یہ اس کی بنیادی صلاحیتوں کا غلط بلکہ شاید جھوٹا استعمال ہوگا اور اسلام تو ظاہر ہے کہ خاص طور پر اس لیے آیا تھا کہ روحانی اور مادّی دنیا کے درمیان دوری کو مٹا دے۔ وہ تو ایک سچے مسلمان کی نشانی یہ بتاتی ہے کہ وہ دنیا اور آخرت کی بھلائیوں (حسنات کی تمنا اور اس کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کوئی طمع نہیں ہے، جیسا کہ ایک ہی وقت میں سب چیزوں کے طلب کرنے کو کہا جاتا ہے، بلکہ اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہے کہ دونوں عالم درحقیقت ایک ہی ہیں اور کوئی شخص بھی ''روحانی'' ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اگر وہ اس دنیا کی زندگی کو بہتر بنانے میں ناکام رہا ہے۔ اس کے برعکس اس نے اپنی روحانی زندگی کو ایک ضابطے میں نہیں ڈھالا ہے تو وہ اس دنیا کی زندگی کو بھی نہیں سنوار سکتا اور اِس دنیا میں کھو گیا وہ تو پھر کہیں کا نہیں رہا۔ یہی بات اقبال نے اپنے مخصوص نکتہ سنجی کے انداز میں یوں کہی ہے:[۲]

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گُم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گُم اُس میں ہے آفاق

فارسی کے عظیم شاعر مولانائے روم نے اِسی مضمون کو نئے انداز سے یوں کہا ہے[۳]:

ہر کہ بر افلاک رفتارش بود
بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود

قرآن کی ایک آیت بھی یہی کہتی ہے:

وَمَن كَانَ فِيْ هَـٰذِهِ أَعْمٰى فَهُوَ فِي الآخِرَةِ أَعْمٰى وَأَضَلُّ سَبِيْلاً.

''اور جو اِس دنیا میں اندھا بن کر رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا بلکہ (راستہ پانے میں) اندھے سے بھی زیادہ ناکام۔'' [بنی اسرائیل:۷۲]

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ انسان کے اچھے یا بُرے اعمال کے نتائج اس کی موت کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے دنیا کو ''مزرعۂ آخرت'' بھی کہا گیا ہے یعنی جو کچھ ہم یہاں بوئیں گے وہی آخرت میں کاٹیں گے۔[۴]

آج کے انسان پر مذہب کی گرفت ـــ خواہ وہ کوئی سا مذہب ہو ـــ کیوں ڈھیلی ہوتی جارہی ہے؟ اس کے اسباب میں سے ایک قوی سبب یہ ہے کہ آج زندگی پر جو دشواری اور بے چینی کا ماحول مسلط ہے اس میں مذہب کوئی موثر رہنمائی دینے سے قاصر ہے، آج کا انسان افلاس، جہالت اور بیماریوں کا شکار ہے، نئی طرح کے توہمات اور تعصّبات کا مارا ہوا ہے۔ تشکیک میں گرفتار اور استحصال کا ہدف ہے، نسلی، قومی، نظریاتی اور علاقائی عصبیتوں میں الجھا ہوا ہے۔ ہمہ وقت جنگ، نسل کشی اور کیمیائی وجراثیمی استعمال سے تباہی کا خطرہ اس کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ ایٹمی تباہ کاری کا بھوت اسے ڈرا رہا ہے۔ اس کی اچھی اور بُری روایتی قدریں مٹادی گئی ہیں مگر اُن کی جگہ نئی اور حیات بخش قدروں نے پُر نہیں کی ہے۔ اس طرح وہ بہت سی منفی طاقتوں کے بیچ میں پھنسا ہوا ہے جنھیں اگر بروقت نہ روکا گیا تو اس بات کا بخوبی امکان ہے کہ قومی سطح پر خودکشی نہیں تو کم از کم اس کی سماجی زندگی میں شدید رخنے ضرور پیدا ہوجائیں گے۔

مگر ان بے کسی کے حالات میں مذہب کا ساتھ چھوڑ جانا ہی یقیناً واحد سبب اس کی گرفت کے کمزور ہوجانے کا نہیں ہے۔ بہت سے ایسے مفکر حضرات بھی ہیں جنھوں نے پوری ایمانداری سے محسوس کیا ہے کہ کسی مخصوص مذہب سے ان کی وابستگی واقعی ایک دشوار کام ہے اگر چہ وہ بھی زندگی میں ایسی بہت سی قدروں کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہیں جنھیں میں ذاتی طور پر ''مذہبی اقدار'' ہی کہوں گا۔ میں سمجھتا ہوں خدا میں اتنا حلم اور مکارم کا احساس ضرور ہے کہ وہ انھیں بھی اپنی آغوشِ رحمت میں لے لے گا۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

''خدا میں اتنی بُردباری ہے کہ وہ پروفیسر آئیر (Ayer) اور مالکم مگرج (Malcolm Muggeridge) کے اس قول کو بھی برداشت کرسکتا

ہے کہ وہ کوئی وجود نہیں رکھتا۔''

مگر کوئی شخص نہ یہ دعویٰ کرسکتا ہے نہ اُسے فرض کر کے آگے بڑھ سکتا ہے کہ ''انسان کا وجود نہیں ہے۔'' ان سے بھی بڑی تعداد اُن لوگوں کی ہے جنھوں نے مذہب کو اتنی ہی آسانی سے ردّ کر دیا ہے جتنی آسانی سے اُسے بہتوں نے قبول کر رکھا تھا۔ یعنی بغیر غور وفکر کی زحمت اٹھائے ہوئے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تقویم پارینہ ہے، جدیدیت کے خلاف ہے، فیشن سے میل نہیں کھاتا وغیرہ۔ اِس گروہ کا معاملہ اور بھی بدتر ہے کیوں کہ ان میں قوتِ فکر اور دیانت دونوں کا فقدان معلوم ہوتا ہے۔

اس شدید ضرورت کے عالم میں کوئی مذہب یا مذاہب انسان کو کیا دے سکتے ہیں؟ کچھ مستثنیٰ افراد کو چھوڑ کر، جو امید گاہ کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے مہاتما گاندھی، شوویتزر، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ۔ مذہب کے حامیوں میں نمایاں طور پر اس بات کا احساس بھی نہیں پایا جاتا کہ اصولِ اخلاق یا نیکیوں کی محض رسمی اور غیر فکر انگیز تبلیغ حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکے گی۔ عبادت کی کچھ مقررہ ظاہری رسموں کو ادا کر لینا، یا چند ثواب کے کام کر لینا کسی ایسے انسان کے لیے تسکینِ قلب کا موجب ہوسکتا ہے جس کے پاس مذہب اور زندگی کے امکانات کی وسعتوں کا بہت محدود تصور ہو۔ مثلاً اِس سے کوئی ایسا دنیادار شخص مطمئن ہوسکتا ہے جو زندگی کا بڑا حصہ دولت بٹورنے میں گنواتا ہو، یا حصولِ جاہ کے لیے کوشاں رہتا ہو یا لغو اور سستی لذتوں کے پیچھے بھاگتا رہتا ہو، مگر کبھی کبھی رسمی عبادت گزاری بھی کر لیتا ہو۔ مذہب کی سچی دعوت تو بہت پُرمعنی اور جچی تلی ہے۔ اس کا مطلب زندگی کو اُس کے اَن گنت شعبوں کے ساتھ اس طرح بسر کرنا ہے جیسے انسان ہمہ وقت اپنے خالق کے حضور میں ہے اور اپنی خودی کی عظیم اور قابلِ قدر صلاحیتوں کو قوت سے فعل میں لانے کے لیے مسلسل جدجہد کر رہا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے:[۵]

> اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِن لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہ یَراک. ''تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو اور یہ نہ ہوسکے تو گویا وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔

اس طرح وسیع ترین مفہوم میں ایک مومن کی ساری زندگی عبادت بن جاتی ہے۔ درحقیقت مذہب کے دو قطعی مختلف تصور ہیں جنھیں اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں ایک چھوٹی سی نظم میں بیان

کر دیا ہے۔ یا تو یہ کائنات کی بیکراں وسعتوں میں خدا کی حمد وثنا کرنا ہے اور اُس کی رضا کو پورا کرنے کی جدو جہد ہے، یا یہ زمین کی آغوش میں عاجزی کے ساتھ سجدہ ریز ہونا اور خدا سے بے سعی و جہد اپنا مدعا طلب کرنا ہے۔ پہلے تصور کو وہ ''مردِ خدا مست وخود آگاہ'' کا مذہب کہتا ہے اور دوسرے کو ''دینِ مُلّا'' یا نباتات وجمادات کے مذہب سے تعبیر کرتا ہے۔[۶] جب میں مذہب کی بات کرتا ہوں تو ظاہر ہے کہ میرا مقصود اُس کے دوسرے مفہوم سے نہیں ہوتا۔ یہ اگر اس چیلنج کا سامنا حوصلے اور ضبط کے ساتھ نہیں کرے گا تو زمانہ اسے روند کر آگے نکل جائے گا۔ اور اگر سب بالغ نہیں تو کم سے کم نوجوان مرد اور عورتیں دوسرے زیادہ طاقتور دھاروں میں بہہ جائیں گے۔

یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوتی ہے کہ اگر چہ اس وقت انسانیت کو ایسے عظیم بحران کا سامنا ہے جس کی نظیر ماضی میں نہیں ملتی، مگر مذاہب آج بھی اپنے حقیر نظریاتی اختلافات میں الجھے ہوئے ہیں اور اُن کی مناظرہ بازی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ دراصل ان لوگوں کو زندگی میں مذہب کے صحیح مقام اور منصب کا اندازہ نہیں ہے۔ ہر شخص خصوصاً ہر ذہین مسلمان کو اس بات سے گہرا قلق ہونا چاہیے کہ اس کے مذہب کے ظاہر وباطن کا تضاد بڑھتا جا رہا ہے۔ مذہب کے لیے کہا گیا ہے کہ یہ ''انسان کی زندگی پر اُس کی رضا ورغبت سے خدا کی حکمرانی کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔'' اور یہ تعریف بڑی حد تک اسلام پر صادق آتی ہے، جہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو خود بھی ایک مومن کی سچی مثال ہیں — یہ کہلوایا گیا ہے:

> قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ. [آل عمران:۱۶۲] ''اے نبی کہہ دیجیے کہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب کچھ خدا ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالن ہار ہے۔''

اگر ایک مسلمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے، اِس دنیا میں بھی اور آخرت کے لیے بھی اور سچے دل سے اپنے ایک خدا پر یقین رکھتا ہے، جو اُس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور میرا ایمان ہے کہ وہ ہے تو اس کے لیے سچے راستے سے بھٹک جانے کا کوئی عذر ہونا نہیں چاہیے۔ اور ضروری نہیں ہے کہ یہ گمراہی بالقصد ہو، یا صراطِ مستقیم سے تمرد وانکار کا نتیجہ ہو، یہ اہم باتوں سے بے اعتنائی اور بے حسی یا غیر اہم باتوں میں غیر معمولی انہاک کا نتیجہ بھی ہوسکتی ہے (مجھے ذاتی

طور پر ان لوگوں کی بے اعتنائی کا ایک سبق آموز تجربہ ہوا، جو بظاہر دین کا درد رکھتے ہیں۔ چند سال ہوئے ٹوکیو (جاپان) میں مذہب اور امن کی عالمی کانفرنس کے انعقاد سے ذرا پہلے میں نے مسلمانوں کے مذہبی اداروں کو ایک گشتی مراسلہ بھیجا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ایک ایسی کانفرنس چند ماہ کے بعد منعقد کرنے کا خیال ہے جس میں تمام مذاہب کے نمائندے اکٹھے ہوں گے اور باہمی سر جوڑ کر مشورہ کریں گے کہ وہ قیامِ امن کے مقصد میں کیا مدد دے سکتے ہیں۔ میں نے ان حضرات سے پوچھا تھا کہ اس تجویز کے بارے میں اُن کا ردِّعمل کیا ہے؟ کیا یہ تجویز انھیں مذہبی نقطۂ نظر سے معقول معلوم ہوتی ہے؟ اور آیا وہ اسے اخلاقی حمایت دینے پر آمادہ ہیں؟ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جتنے اداروں کو سوالنامہ بھیجا گیا تھا اُن میں سے صرف ایک نے جواب دینے کی زحمت گوارا کی۔ یہ اتفاق سے حسبِ دلخواہ جواب تھا جس میں تجویز کی تائید کی گئی تھی۔ مجھے بہرحال یہ شبہ ہے کہ جس ادارے نے میرے سوالنامے کا جزوی جواب دیا اُس کا سربراہ برسوں پہلے میرا شاگرد رہ چکا تھا۔ میں یہ تو نہیں سمجھتا کہ دوسرے اداروں کے جواب نہ دینے کا سبب یہ تھا کہ وہ امن کے حامی نہیں، بلکہ وہ اِن باتوں کو ذاتی تشویش کے مسئلوں میں سے نہیں سمجھتے اور یہ باتیں اُن کے محدود مفادات کے دائرے میں نہیں آتیں۔)

نیکی کے فروغ میں بااثر لوگوں کے بے اعتنائی اور بے تعلقی برتنے سے دنیا کو جتنا نقصان ہوا ہے اتنا اشرار کی شر انگیزیوں سے بھی نہیں ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مذہب کی حیثیت سے معاشرتی مسائل کا سامنا کرنے اور حوادث سے پریشانی محسوس کرنے میں آج اسلام کی بہ نسبت عیسائیت (بالفاظ دیگر مسلمانوں کے مقابلے میں عیسائی) کہیں آگے ہے۔ حالانکہ اسلام ہی نے سب سے پہلے کھلے الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ ہر انسان کو نیک کام سے تعاون کرنا چاہیے اور "اِثم و عُدوان" سے کوئی تعلق نہ رکھنا چاہیے۔ اگر مذہب اس خوابِ خرگوش سے بیدار نہیں ہوتا اور خاص طور پر اسلام جو فی الوقت ہمارا موضوعِ سخن ہے، تو وہ ایک حُر کی قوت اور حیات افزا طاقت بن کر نہیں رہ سکتا جیسا کہ ماضی میں رہا ہے ہے، یا یہ خوش گمانی کی جاتی ہے کہ مستقبل میں ایسا بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

جب میں آج کی اصطلاحوں میں مذہبی تعلیمات کی تفسیر کرنے کی بات کرتا ہوں تو میرا یہ مدّعا نہیں ہوتا کہ جدید سائنس یا ٹیکنالوجی یا فلسفہ و اقتصادیات یا دوسرے شعبہ ہائے علوم اپنے مخصوص میدانوں میں جن باتوں کو صحیح سمجھتے ہیں انھیں بجنسہٖ مذہب کو بھی قبول کر لینا چاہیے۔ دوسرے مذاہب کی

طرح اسلام کے بعض وکیلوں نے بھی اکثر یہ نظریہ اپنایا ہے۔ مثلاً ہندوستان میں سرسید احمد خاں نے۔ مگر اس میں کچھ کھلے ہوئے خطرے بھی ہیں۔ ایک زمانے میں جغرافیہ داں یقین رکھتے تھے کہ زمین چپٹی ہے۔ آج اُن کا عقیدہ ہے کہ زمین گول ہے۔ جدید سائنس اس بات کی سختی سے تردید کرتی ہے کہ یہ کائنات چھے دن میں پیدا ہوئی ہے اُس کا عقیدہ ہے کہ آفرینش کا عمل اربوں سال تک جاری رہا ہے اور ڈارون کے نقطۂ ارتقا کی رو سے انسان کا مورثِ اعلیٰ بندر ہے۔ اگر علمائے متقدمین نے یہ سمجھا ہے کہ ابتدائی نظریات مذہب کے نظریات بھی ہیں تو اب اپنی ذہانت کی قوت سے یہ ثابت کرنا علمائے جدید کا کام ہے کہ صحفِ سماوی میں زمین کو فی الواقع گول ہی بتایا گیا ہے اور کائنات کی تخلیق کا عمل نا قابلِ حصر زمانے تک جاری رہا ہے اور بقائے اصلح کا اصول ہی ارتقا کے پیچھے کارفرما رہا ہے۔ نہیں بلکہ ہمیں یہ حقیقت سمجھ لینی چاہیے کہ صحفِ سماوی سائنس کی کتابیں نہیں ہیں جو وہ اِن مسائل سے بحث کریں۔ اگر یہ سائنس کی کتابیں ہوتیں تو ہر بار سائنس کے نئے اکتشافات اور علوم کی سرحدوں میں نئی توسیع کے ساتھ ہی اُن پر بھی نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت پیش آیا کرتی جو قطعاً نا قابلِ عمل صورت ہے۔

اگر واقعی ان صحف میں ایسے سوالات کا حتمی جواب موجود ہوتا تو انھوں نے یا تو سائنس کی تحقیقات اور علوم کی ترقی کا گلا گھونٹ دیا ہوتا یا ان کی شہرت کو بٹا لگا دیا ہوتا۔ اسی وجہ سے یہ عیسائی کلیسا کی غلطی تھی کہ اس نے گیورڈ نو برنو (Giordano Bruno) کو بدعقیدہ قرار دے کر اُس کا حقہ پانی بند کر دیا اور اُسے زندہ جلوا دیا۔ محض اس قصور پر کہ اور باتوں کے علاوہ وہ یہ عقیدہ بھی رکھتا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور خود محورِ کائنات نہیں ہے۔

صحفِ سماوی خواہ وہ اسلامی ہوں یا دوسرے مذاہب کے ہوں بنیادی طور پر الہامی کتابیں ہیں جن کا مقصد مردوں اور عورتوں کو انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی نیک زندگی کی دعوت دینا ہے تاکہ وہ ان اخلاقی اور معاشرتی قدروں کو پروان چڑھائیں جو اس مقصد کی تکمیل کے لیے اہمیت رکھتی ہیں اور انھیں ایسے کام کرنے کی تشویق اور توانائی مل سکے جو نمایاں طور پر اور صحیح ترین معنوں میں ''انسانیت'' کے کام ہیں، جو انسان کو اللہ سے قریب لانے والے ہیں، جن میں انسان کے باہمی رشتوں کی تقدیس کا احترام ہو اور جو تا حدِّ امکان خداوندی صفات اور عظمت کی علمبردار ہوں اسی کو ایک مشہور قول میں ''تخلّقو باخلاق اللّٰہ'' کہا گیا ہے۔ یعنی اپنے اخلاق میں خدا کی صفات کا جلوہ پیدا کرو۔

سائنس اور مذہب اصل میں حقیقت کو پانے کے لیے دو الگ الگ راستے ہیں۔ دو جداگانہ طریقے جن سے حقیقت کے مختلف چہروں کی جھلک نظر آتی ہے اور دونوں ہی اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ ایک شخص اسے علم خارجی میں معروضی طور پر اور آزادئ فکر کے ساتھ دیکھتا ہے، دوسرا وجدانی طور پر ادراک کرتے ہوئے اور داخلی سطح پر انھیں خداوندی ہدایات کی روشنی میں دیکھتا ہے جو اسے اللہ کے پیغمبروں کے ذریعے ملتی ہیں۔ چنانچہ جب کوئی شخص زندگی اور مذہب کے رشتے کی بات کرتا ہے— زندگی خواہ وہ خام اور سادہ حالت میں ہو یا اپنے کثیر اور شاندار پہلوؤں کے ساتھ— تو اس شخص کو یہ ذہن میں رکھنا ہوگا کہ مذہب کا بنیادی عمل ایک ایسا پُل بنانا ہے جو زندگی کی سادگی اور فطری سادہ لوحی کو اس کے مکمل اور شاندار ارتقاء سے مربوط کرنے والا ہو— انسان— جیسا کہ ہمیں معلوم ہے— خیر و شر کا ایک ایسا ناقابلِ فہم مرکب ہے کہ ان میں سے کسی عنصر کو بھی آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

میں جس نکتے پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کوئی شخص ذاتی طور پر خیر کی طرف نہیں بڑھ سکتا جب تک وہ بلا ارادہ اور بغیر مفاہمت کیے ہوئے شر سے جنگ نہ کرے، خواہ وہ کہیں بھی پایا جاتا ہو اور نہ شر کی بیخ کنی ہمیشہ کے لیے کرنا ممکن ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا کمال ہے کہ ایک بار حاصل ہو جائے تو اس سے ہمیشہ تمتع کیا جا سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ خدا نے اپنے متعدد پیغمبروں کو بنیادی طور پر ایک ہی پیغام دے کر بھیجا مگر ان میں سے کوئی بھی اس دنیا کو ہمیشہ کے لیے ایک مثالی جگہ بنا دینے پر قادر نہ ہو سکا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے خدا قادرِ مطلق ہے، مگر اس نے انسان کو خیر و شر میں امتیاز کرنے کی آزادی بخشی ہے۔ زندگی کی کامیابی یہی ہے اور یہی اس کا المیہ بھی ہے کہ خیر و شر کی قوتوں کا یہ تصادم، ایک طرف اس کا عظمت کی بلندیوں تک پہنچنے اور دوسری طرف بستیوں میں گرنے کا رجحان، ایک مسلسل اور دائمی مظہر رہا ہے۔

صرف مذہب ہی کو نہیں بلکہ دوسری تمام اچھی سماجی قوتوں اور شعبوں کو اس مبارک جنگ میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ ہر نئی نسل از سرِ نو اس جنگ کو شروع کرتی ہے کیوں کہ جن مسائل پر قابو پانا ہے اور جن مزاحمتوں کو دور کرنا ہے اُن کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ نسلِ نَو اُن سے مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتی۔ اگر مذہب یعنی اُس کے پیشوا علماء اور علمبردار اس زندہ اور دلچسپ ڈرامے میں اپنا رول ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں تو وہ نہ صرف اپنی ایک عظیم ذمہ داری کے ادا کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں بلکہ انھیں پھر یہ ماتم کرنے کا جواز بھی نہیں رہتا کہ عہدِ حاضر میں مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے جیسا کہ یہ ان میں

سے اکثر حضرات کہتے رہتے ہیں۔ انھیں اپنے آپ کو تقدس مآب بنا کر پیش کرنے کی ذہنیت کو بھی ختم کرنا ہوگا۔ گویا وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں کہ خلق اُن کا اکرام کرے۔ یہ لوگ خاص انداز کا لباس پہن کر یا دقیق اصطلاحوں میں گفتگو کر کے عوام پر اپنے تقدس اور برتری کا رعب ڈالتے ہیں یا روزمرّہ کے کام اپنے ہاتھ سے کرنے میں کسرِ شان سمجھنے لگتے ہیں۔ مثلاً خود میں نے بعض علماء کو یہ بحث کرتے سنا ہے کہ سائیکل پر سواری کرنا یا بازار سے سودا سلف لانا اُن کے شایانِ شان نہیں ہے۔ حالاں کہ حضرت مسیح نے کبھی اس طرح نہیں سوچا نہ ہمارے پیغمبرؐ کا یہ اندازِ فکر تھا بلکہ مشرکینِ مکہ تو ہمارے نبی کو دیکھ کر یہ کہا کرتے تھے:

وَقَالُوا مَالِ هَذا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعامَ وَ يَمْشِي فِي الأَسْواقِ. [۷/ ۲۵] (وہ کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا ہے اور بازار میں چلتا ہے۔

اسی سورہ میں تھوڑا آگے چل کر یہ حقیقت بھی بیان ہوئی ہے کہ انبیائے سابقین نے نہ کبھی اپنی اُمت کے ساتھ گھُل مل کر رہنا چھوڑا نہ اپنے آپ کو بزرگ و برتر ہستی بنا کر پیش کیا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا انَّهُم لَيَأْكُلونَ الطَّعَامَ وَ يَمْشُونَ فِي الأَسْواقِ. [۲۵-۲۰] اے محمد تم سے پہلے ہم نے جو رسول بھیجے وہ سب کھانا کھانے والے اور بازاروں میں پھرنے والے لوگ ہی تھے۔

بلکہ سڑکیں اور بازار اِن پیغمبروں کی تبلیغ کا سب سے پسندیدہ مرکز رہے ہیں۔ خواہ وہ عیسیٰ علیہ السلام ہوں یا ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم وسلم) ہوں۔ یا دوسرے انبیاء ہوں۔ یہ حضرات بسم اللہ کے گنبد میں بند ہو کر نہیں بیٹھتے تھے بلکہ اگر زندگی کی گہما گہمی سے تھوڑی دیر کے لیے دامن بچا کر خلوت بھی اختیار کرتے تھے تا کہ اپنے نفس اور خالق کا گہرا عرفان حاصل کر سکیں، تو اُن کا یہ خلوت کدہ بھی ایسا ''بسم اللہ کا گنبد'' نہیں بلکہ کسی پہاڑی کی کھوہ میں یا شہر کے کسی پرانے قبرستان یا صحرا کے کسی گھنے درخت کے نیچے جا بیٹھتے تھے۔ ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ انبیاء کی اس سنت کو تاریخ کے مختلف ادوار میں ان کے بعض سچے اور مخلص متبعین نے بھی زندہ رکھا ہے۔ وہ فقر و فاقہ میں رہے ہیں مگر انھوں نے دکھ بھری انسانیت سے اپنا رشتہ نہیں توڑا ہے۔ مسلمانوں میں ایسی بہت سی اعلیٰ درجے کی مثالی شخصیتیں ہوئی ہیں جنھوں نے بنی نوع انسان کی خدمت کو اپنا وظیفہ بنا لیا تھا، جو نہ صرف عام انسانوں کی روحانی تربیت

کا کام انجام دیتے تھے بلکہ ان کی احتیاج اور نفسیاتی مشکلوں کے وقت میں مادّی امداد بھی کرتے تھے، وہ پارچہ بافی یا جلد سازی یا کتابت قرآن جیسے معمولی پیشوں سے اپنی قلیل معاش حاصل کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی اپنی روزمرّہ کی عبادت وریاضت بھی جاری رکھتے تھے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ طرزِ عمل عمومی طور پر تمام مذہبی رہنماؤں کی خصوصیت رہا ہے۔ جب تک وہ مذہب کو اُس کی صحیح جگہ پر نہیں رکھیں گے یعنی بازاروں میں عام لوگوں کے گھروں میں بلکہ اُن کے دلوں میں اور میدان جنگ میں، جہاں ہر طرف خون خرابا ہوتا ہے، تب تک اس کا گہرا اور بھرپور نفوذ نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ ان معاملات ہی سے ان کے بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں اور لیتے رہیں گے جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہم ان مسائل سے نہ آنکھیں چرا سکتے ہیں نہ دامن بچا سکتے ہیں۔

درحقیقت یہ بہت ہی دشوار بلکہ خطرناک موقف ہے۔ اس کا مطلب ہے سماج کے اجارہ داروں، ظالم حکومتوں، بااثر اور مالدار لوگوں کے خلاف محاذ بنانا جن سے بصورت دیگر انھیں سرپرستی بھی مل سکتی ہے لیکن تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ مذہب کے سچے پرستاروں نے خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم ہوں، حق کی حمایت میں سینہ سپر ہوکر خطرات مول لیے ہیں۔ لیکن ایسے قابلِ احترام حضرات اِکّا دُکّا ہی ملیں گے۔ کسی مذہب کی صحت برقرار رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد جس میں نہ صرف مذہبی پیشوا بلکہ عام آدمی بھی شامل ہوں، حوصلہ مندی کے ساتھ شر کی ان قوتوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے میدان میں کود پڑے جنھوں نے معاشرت پر غلبہ حاصل کر رکھا ہو۔

اس کا مقصد اسلام کے تمام پہلوؤں کی مکمل تصویر پیش کرنا نہیں ہے نہ اس کی ساری تعلیمات کا جائزہ لینا ہے، بلکہ اس کا مقصد محدود ہے یعنی اسلام کے بنیادی پیغام کے بعض اُن پہلوؤں کو اُجاگر کرنا جن کا تعلق خاص طور پر عہدِ حاضر کی زندگی سے ہے۔ مجھے یہ نظر آرہا ہے کہ بہتر انسان اور بہتر معاشرے کی تشکیل کے لیے اسلام کی جہدِ مسلسل عہدِ حاضر میں خصوصی معنویت اور جواز رکھتی ہے۔

میں نے اس کوشش کی جرأت اِس لیے اور بھی کی ہے کہ اسلام کی تعلیمات اور مقاصد کے بارے میں آج بھی بہت سی غلط فہمیاں عام ہیں۔ بعض حالات میں یہ غلط فہمیاں بالکل خلوصِ نیت کے ساتھ ہوسکتی ہیں لیکن اکثر حالات میں یہ تاریخی اسباب سے پیدا ہونے والے تعصّبات یا بے خبری پر مبنی

ہیں۔ جہاں تک خود مسلمانوں کے درمیان ایسی غلط فہمیوں کے وجود کا سوال ہے اس کے متعدد اسباب تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ یہ کچھ تو اس وجہ سے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنی فکر اور انتقادی بصیرت کو اچھی طرح استعمال نہیں کیا جس کے ذریعے فروعات اور زوائد کے انبار سے اصلی تعلیمات کی بازیابی ممکن ہوتی جو صدیوں کے طویل عرصے میں اُن کے گرد جمع ہوگئی ہیں۔ اور کچھ اس کا یہ سبب بھی ہے کہ مذہبی علماء اُن کے سامنے اسلام کی توانائی، فعالیت اور عصر حاضر میں اُس کے پیغام کی معنویت واضح کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ وہ اس کا مغز حاصل کرنے کے بجائے پوست ہی سے بہلے ہوئے ہیں۔ مگر کسی حد تک اس کا سبب مذہبی اقدار سے عہد حاضر کی بے اعتنائی بھی ہے۔ ان قدروں کی اہمیت کو یا تو آج کے لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں یا سمجھنا چاہتے ہی نہیں۔ یہ حقیقت بہر حال تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ لوگ مذہب کے منکر نہیں ہیں اور بزعمِ خویش مذہب کے مقصد اصلی کے بارے میں ان کی بے خبری برابر بڑھتی ہی جارہی ہے۔ مذہب کے لیے اُن کے ایجاب کی نوعیت مختلف ہے۔ اس میں ایک طرف بے اعتنائی اور مایوسی ہے تو دوسری طرف اس کا پیکرِ خیالی مذہب جنون اور اصلاح دشمنی کا ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی شخص اسلام کے اصلی خط وخال دکھانے میں کامیابی حاصل کرسکے اور اُس کی تعلیمات میں جدید دور سے متعلق کچھ ایسے مضمرات کی جانب اشارہ کرسکے جن کی روشنی میں وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں تو یہ یقیناً ایک مستحسن کام ہوگا۔

دوسرے مذاہب کے ماننے والوں میں بھی اسلام کے بارے میں خوب خوب غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر چہ ان کی نوعیت مختلف ہے۔ یہ صرف ایسے لوگوں ہی میں نہیں ہیں جو ان ملکوں میں رہتے ہیں جہاں مسلمان خال خال پائے جاتے ہیں بلکہ ان ملکوں میں بھی عام ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے یا وہ خاصی بڑی تعداد میں بستے ہیں۔ عیسائیوں کی مخالفانہ تنقید کے اسباب تو ہم کسی حد تک صلیبی جنگوں کے سلسلے میں تلاش کرسکتے ہیں جب اسلام اور عیسائیت کا براہِ راست مقابلہ نہ صرف تبلیغ کرنے والے دو بڑے مذہبوں بلکہ دو بڑی تہذیبوں کی حیثیت سے ہوا۔ لیکن اس سب کے باوجود یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں اسلام نے مغربی علوم سے بہت استفادہ کیا، خاص طور سے قدیم ماخذوں میں یونانی زبان کی کتابوں سے اور اس طرح یورپ کے کھوئے ہوئے علمی خزانوں کو گویا مع سود کے انھیں واپس کردیا تھا۔ پھر اسلام اُن کے ساتھ علوم وثقافت کے مختلف شعبوں کو

مالا مال کرنے میں برابر کا شریک رہا۔لیکن مغرب کے قدیم مصنفین رسول اللہؐ کے بارے میں بہت ہی کم واقفیت رکھتے ہیں اور جب کچھ لکھتے ہیں تو اُن کا لب ولہجہ انتہائی توہین آمیز ہوتا ہے۔ یہ بات اس لیے اور بھی زیادہ افسوس ناک ہوجاتی ہے کہ اسلام جیسا کہ قرآن میں واضح الفاظ میں بتادیا گیا ہے نہ صرف عیسائیت سے بہت سی باتوں میں مشابہت رکھتا ہے اور اُس کے بانی کا اُسی طرح احترام کرتا ہے جیسے وہ اسلام ہی کے عظیم پیغمبروں میں سے ایک ہیں، بلکہ اس نے عیسائی فرقے کے بعض دوسرے افراد کے لیے بھی خصوصی محبت کے جذبات رکھے ہیں۔

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ آمَنُواْ الْيَهُودَ وَالَّذِيْنَ أَشْرَكُواْ وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ آمَنُواْ الَّذِيْنَ قَالُوَاْ إِنَّا نَصَارَى ذَلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِيْنَ وَرُهْبَاناً وَأَنَّهُمْ لاَ يَسْتَكْبِرُون. وَإِذَا سَمِعُواْ مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَى أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُواْ مِنَ الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِيْنَ.

[المائدہ:۸۲،۸۳]

تم اہلِ ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تر اُن لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرورِ نفس نہیں ہے۔ جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اُترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوجاتی ہیں اور وہ بول اٹھتے ہیں کہ پروردگار ہم ایمان لائے ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔

لیکن یہ افسوس ناک غلط فہمیاں صدیوں سے چلی آتی ہیں۔ اگر چہ اس میں بعض خصوصاً غیر مذہبی عیسائی مصنفین کا خوشگوار استثناء بھی ہے۔ گزشتہ برسوں میں اور ذی شعور عیسائی مصنفین کے ہندومت اور بدھ مت کے ہمدردانہ مطالعہ شروع کرنے کے بعد— انھوں نے اپنی توجہ اسلام کی طرف مبذول کی ہے اور اس کی خدمات کا اعتراف کرنے لگے ہیں۔ اس کے باوجود عیسائیوں میں اب بھی

اسلام کا ایک مسخ شدہ تصور پھیلا ہوا ہے۔ یہ لوگ اسلام کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جیسے وہ خیر دوستی اور رحم دلی کے جذبات سے عاری ہے اور اسے عام طور سے ''بزورِ شمشیر'' پھیلنے والے مذہب کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے جس کا نعرہ یہ ہے کہ ''کلمہ پڑھو ورنہ موت کے گھاٹ اُترو'' یہ سمجھنا بہت دشوار ہے کہ دوسرے مذاہب کے ساتھ اسلام کے رویے پر بحث کرتے ہوئے فان گرونیبام (Von Grunebaum) جیسا بلند مرتبہ عالم بھی یہ کہہ اٹھتا ہے:

> ''دنیا مرد مومن کا حق ہے۔ اس پر ان فرقوں کے کچھ حقوق تو ہیں جن کے پاس وحیِ الٰہی کا کچھ حصہ موجود ہے لیکن مشرکین کے لیے کچھ بھی نہیں۔ اسلامی شریعت نے بُت پرستوں کے لیے صرف ایک ہی راستہ چھوڑا ہے کہ یا تو وہ اپنا مذہب تبدیل کرلیں یا پھر موت کے گھاٹ اُتر جائیں۔''[۷]

دوسرے مذاہب سے اسلام کے تعلقات پر ہم آگے چل کر وضاحت سے گفتگو کریں گے۔ یہاں تو سردست ان قابل افسوس غلط تعبیروں کی طرف سرسری اشارہ کرنا ہی مقصود تھا۔

۱۹۳۶ء کی بات ہے امریکہ میں ایک کتاب ''زندگی کے راستے'' (Paths of Life) شائع ہوئی تھی جس کے مصنف چارلس موریس ہیں۔ اس میں ایک باب کا عنوان ''طریقِ محمدی'' بھی ہے جو غلط فہمی اور غلط ترجمانی کی حیرت انگیز مثال پیش کرتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اسلام نے تمام انسانوں کو صرف دو خانوں میں تقسیم کر دیا ہے یعنی مومن اور کافر (جنھیں یہ مصنف مسلم اور غیر مسلم کے مرادف سمجھتا ہے) پھر کہتا ہے کہ اسلام ہر ثواب کو مومن کے لیے اور ہر عذاب کو کافر کے لیے مخصوص سمجھتا ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جو ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ وہ بھی سب کی طرح ایک بشر ہیں بس اتنا فرق ہے کہ ان کے پاس خدا کی طرف سے وحی آتی ہے، انھیں یہ مصنف اسلام کے نزدیک ''نیم خدا اور نیم بشر'' بتاتا ہے جو ''کافر کلمہ پڑھنے سے انکار کریں ان سے مسلسل جدال وقتال کرو۔ دشمنی رکھو، اور انھیں موت کے گھاٹ اُتار دو۔''[۸]

قرآن نے خدا کو رحمٰن ورحیم کہا ہے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کو حکم دیا ہے کہ وہ بھی اپنے اندر ایسی ہی ربانی صفات پیدا کریں اور خود آپ کی مبارک زندگی کا اُسوۂ حسنہ بھی یہی رہا ہے۔ مگر چارلس موریس اسلام میں اللہ کے تصور کو محمد کی شخصیت کا اطلال ہی سمجھتا ہے اور اس کی جو تصویر

اس نے کھینچی ہے وہ اس کی ناواقفیت کے سوا گندے ذہن کی غماز بھی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقل کے استعمال پر دوسرے تمام انبیاء سے زیادہ اصرار کیا ہے (جیسا کہ ہم آگے چل کر تفصیل سے بحث کریں گے) لیکن اِس مصنف کا خیال ہے کہ آپ کی زندگی میں منطق کا کوئی گزر نہ تھا۔ اللہ کا یہ بندہ جس نے اپنی زندگی کی طویل ساعتیں غارِ حراء میں مُراقبہ و مناجات کرتے ہوئے گزاری تھیں، جو روزانہ عبادت میں طویل قیام و قعود کرتا تھا، اس مصنف کے نزدیک ایسی شخصیت ہے جس کے یہاں خلوت، ترک و تجرید، یا اعتدال پسندی بالکل اجنبی صفات ہیں۔ اُس نے آپ کو ایک ایسی شخصیت کے روپ میں پیش کیا ہے جو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہر طریقہ استعمال کرتی تھی۔ ایسی متعصّبانہ نظر ہو تو اس کا یہ سمجھنا بھی کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ ''دوسرے انسانوں کو مسلمان صرف ایک دہشت، ایک بلائے ناگہانی یا ایک خونخوار درندے کی شکل میں نظر آتا ہے۔'' آگے چل کر یہ بھی کہتا ہے کہ ''مسلمانوں کی طاقت ان کے رہنما'' ان کی جماعت اور دشمن کے مقابلے میں ہے۔'' وہ ہمیشہ اپنے حریفوں کو نیست و نابود کرنے کی فکر میں لگے رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کم از کم زمانۂ ماضی میں انھیں کبھی ایسی مکمل کامیابی نصیب نہیں ہوسکی جس کے بعد بس وہی وہ باقی رہ جائے۔ ہٹلر نے ساری تحریک اسلام کو اپنے ایک ہی عمل میں دکھا دیا۔ اس کا موازنہ حضرت محمد سے تقریباً جزوی تفصیلات میں بھی مکمل ہے۔ مین کیف (Main Kampf) کو آج کا قران سمجھنا چاہیے۔''

میں نے اس کتاب سے تین اقتباسات پیش کیے ہیں اس لیے نہیں کہ میں اس کتاب کو کچھ بہت زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آج بہت سے روشن خیال عیسائی بھی اس نظریے کا مکمل طور پر ردّ کریں گے۔ مجھے تو یہاں صرف یہ دکھانا تھا کہ بیسویں صدی کے روشن عہد میں بھی اندھا تعصب ایک ایسے شخص کے دماغ پر کس طرح قبضہ کرسکتا ہے جسے بظاہر تعلیم یافتہ، سمجھا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ اس مصنف نے اسلام کی معقول ترجمانی کرنے والی عیسائیوں کی تصانیف کا مطالعہ بھی نہیں کیا ہے۔ قطعاً غیر متعصب مآخذ، یا قرآن کریم، یا سیرۃ نبوی کے بارے میں تو وہ یقیناً بالکل نابلد ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ کتاب جس میں دوسرے مذاہب کا تذکرہ بھی ہے کم از کم اسلام کی حد تک تو قابلِ رحم حد تک جاہلانہ ہے۔ مگر یہ شائع ہوئی ہے اور اسے ہزاروں انسانوں نے پڑھا ہوگا۔ ان میں کچھ پڑھنے والے بھی اسلام سے ایسے ہی نابلد ہوں گے جیسا کہ یہ مصنف ہے اور وہ ان

بیانات کو محض اس لیے سند بنا سکتے ہیں کہ انھوں نے ''کتاب میں پڑھا ہے۔'' جو لوگ مذہب کی اہمیت اور شخصیت سازی میں اس کے اثر کو تسلیم کرتے ہیں انھیں اس طرح کے ذہنی اور اخلاقی دیوالیہ پن کے خلاف جہاد کرنا چاہیے۔ جب تک اس کی بیخ کنی نہ ہوگی حقیقی مذہب ہماری زندگی پر اپنا اثر نہیں ڈال سکے گا۔ بہت سے ہندو بھی اس طرح اسلام کی حقیقی روح کے بارے میں شدید غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں اور اس کے کچھ سیاسی اور تاریخی اسباب ہیں۔ ہندوستانی تاریخ کے زمانۂ وسطیٰ اور عہد جدید میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے سیاسی جھگڑوں نے تعصب کی آگ کو دونوں طرف بھڑکایا ہے۔ تعصب کی عینک لگا کر کسی مذہب یا تاریخ کے بارے میں صحیح اور غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کرنا ہمیشہ دشوار ہوتا ہے۔ اس کے سوا یہ سبب بھی ہے کہ کبھی کبھی مسلمانوں نے بھی اپنی مسخ شدہ اور مکروہ تصویر پیش کی ہے اور مسلمان حکمرانوں نے فوجی چڑھائیاں اور فتوحات کرنے میں ایسی تنگ نظری اور تعصب کا مظاہرہ کیا ہے جو قطعاً اسلام کی روح کے منافی تھا۔

یہاں یہ سوال یقیناً کیا جا سکتا ہے کہ وہ مذہب کون سا ہے جس کے پیروؤں نے اس طرح کے بلکہ کبھی ان سے بھی بدتر اعمال نہ کیے ہوں۔ لیکن یہ الزامی جواب میرے نزدیک کوئی تسلی بخش موقف نہیں ہے۔ تنقید کرنے والوں نے بہر حال مسلمانوں کے اعمال میں اُن کے عقائد کی جھلک دیکھی ہے۔ میرا عندیہ ہے کہ ایسے معاندانہ تجزیے میں مسلمانوں کو اپنے سیاسی مخالفوں یا نکتہ چینیوں پر زیادہ ذمہ دارانہ رویہ اپنانا چاہیے۔ ان کا کام یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کو اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال میں رچا کر اپنے مذہب کی اچھی اور لُبھانے والی تصویر پیش کریں۔ یہ کہنے کے بعد مجھے پھر بھی پہلی بات کو دُہرانا ہے کہ الزامی جواب ایک غلط اور ناعاقبت اندیشی کا فیصلہ ہوگا۔ اگر تمام مذاہب عالم پر ایسی ہی تنقید ہو سکتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس سے سب مذاہب کے تصور کو گزند پہنچتا ہے۔ مذاہب کا مطالعہ اُن کی بہترین تعلیمات کی روشنی میں کیا جانا چاہیے جو وہ نہ صرف اپنے مخصوص پیروؤں کے لیے بلکہ مجموعی طور پر ساری انسانیت اور تمام عالم کے لیے پیش کرتے ہیں۔

اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر وہ کون سا عظیم اضافہ ہے جو ان میں سے تمام مذاہب نے نیکی اور رحم دلی کے جذبات کو فروغ دینے کے سلسلے میں کیا ہے؟ یا جس سے سماجی انصاف کے نظریات کو تقویت ملی ہے اور عام آدمی کو زندگی کی کڑیاں جھیلنے میں آسانی ہوگئی ہے۔ یا جس سے عمومی طور پر انسانی

کردار میں اس جنگ خیر وشر اور بار بار لڑنا پڑتی ہے۔ اگر ان مذاہب کے پیرووں نے اپنی عظمت کو کھو دیا ہے تو اس کا سبب اُن کی کوتاہ بینی اور کمزوریاں ہیں یا یہ ہے کہ وہ اپنی جبلی بہیمیت سے بلند نہیں ہو سکے ہیں لیکن دوسروں کو سنگسار کرنے میں پہل کون کر سکتا ہے؟ میرا مقصد تو یہ ہے کہ اسلام کی دعوت وعزیمت کو جیسا میں نے سمجھا ہے اسے دوسروں کو بھی خواہ وہ مسلمان ہو یا کسی دوسرے بڑے مذہب کے پیرو ہوں بہتر طور پر سمجھنے کے لیے آمادہ کر سکوں۔

میری یہ خواہش صرف اس لیے نہیں کہ خود مجھے اسلام سے یا اس کا دفاع کرنے سے دلچسپی ہے۔ مجھے دنیا کے دوسرے مذاہب کی مفاہمت اور اُن کے پیرووں کے ہمدردانہ مطالعے کو فروغ دینے کے مسائل سے بھی اتنی ہی دلچسپی ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک مذاہب ایک دوسرے پر حملہ کرنے کی نیت سے فوجوں کی طرح صف آرا کھڑے رہیں۔ یہ تو خود مذہب کی روح کے منافی ہے۔ ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان مذاہب میں مماثلت اور مشابہت کے گہرے اور بنیادی عناصر موجود ہیں خواہ وہ ایک سطحی یا متعصّبانہ مطالعہ کرنے والے کو ہمیشہ دکھائی نہ دیتے ہوں۔ تاریخ کے ہر دور میں مذہب کا نشو ونما ایک مسلسل تحریک کی صورت میں ہوتا رہا ہے۔ اس طرح نہیں کہ گویا متعدد خدا تھے ہر ایک کا اپنا اپنا علاقہ بٹا ہوا تھا اور وہ اپنے اپنے ماننے والوں کو مختلف اور متضاد احکام بھیجتے رہے۔ قرآن کا کہنا تو یہ ہے:

لَو كانَ فيهِمَا آلهتين إلّا اللّٰه لَفَسَدَتَا. [۲۲-۲۱]

''اگر (زمین اور آسمان میں) ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو دونوں کا فساد یقینی تھا۔''

یہ ایسا نکتہ ہے کہ خدا کے وجود پر ایمان رکھنے والے کسی بھی مذہب کو اسے قبول کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے نہ کہ کوئی اچنبھے میں ڈالنے والی بات ہے۔ اگر تمام مذاہب کا سرچشمۂ فیضان ذات خداوندی ہی ہے اور اُسی نے اپنا پیغام اپنے برگزیدہ بندوں کی وساطت سے مختلف ادوار میں مختلف اقوام عالم کی طرف بھیجا ہے تو اس پیغام کو لازمی طور پر ایک بنیادی وحدت کا ہونا ضروری ہے۔ تفصیلات یا رسوم کا اختلاف ہو سکتا ہے، کیونکہ مادّی یا سماجی حالات زمان ومکان کے لحاظ سے خاصے مختلف رہے ہیں لیکن زندگی کی اخلاقی اور تہذیبی بنیادیں اچھے اور باعزم کردار کے اصول، سماجی رشتوں کو چلانے والے

ضابطے، اساسی طور پر متضاد نہیں ہو سکتے۔

لیوس ممفرڈ (Lewis Mumford) نے اپنی بصیرت افروز کتاب ''طرزِ زندگی'' (Condut of Life) میں — جس کا میں نے پہلے بھی کہیں حوالہ دیا ہے — ایسے اہم نکات کی طرف اشارے کیے ہیں جو قدیم مذاہب میں مشترک ہیں۔ ان میں شہادت اور بقائے دوام کا وہ نظریہ بھی شامل ہے جس کی وجہ سے انسان دنیا کے وقتی مفادات اور ذاتی اغراض کو کسی بڑے نصب العین کی خاطر قربان کر سکتا ہے اور اسی اعتقاد کی وجہ سے اس کو بہت سی جاوداں رہنے والی کامیابیاں حاصل ہو سکی ہیں۔ انسانیت کے ارتقاء کے لیے صرف دنیوی علائق اور وقتی مفادات سے خاص طرح کی بے تعلقی ہی ضروری نہیں ہے بلکہ وہ کبھی کبھی یہ سمجھ کر بھی عمل کر سکتا ہے جیسے واقعی اس کی زندگی جاوداں ہوگئی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اسی بات کو یوں کہا ہے:

دنیائے دنی سرائے فانی سمجھو
ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو[9]

آگے چل کر ممفورڈ اشارہ کرتا ہے کہ جدید علم حیاتیات کے تصدیق کرنے سے بہت پہلے مذہب نے زندگی کے حیرت انگیز تار و پود کا وہ تصور پیش کر دیا تھا جس کی رُو سے تمام جاندار مخلوقات ایک دوسرے کے سہارے زندہ ہیں۔

> ''زندگی میں باہمی انحصار کی حقیقت اور انسان کے لیے کائنات کے مسخر کیے جانے کا مذہب نے ایک مجمل خاکہ پیش کیا تھا۔ پچھلی تین صدیوں میں سائنس نے اپنی متنوع تفصیلات سے محض اس اجمال کی بنیادی باتوں کی تصدیق کی ہے اور اس خاکے میں بوقلمی رنگوں کی آمیزش سے خالی جگہوں کو پُر کیا ہے۔''[10]

مذاہب نے انسان پر زندگی کے بنیادی تقدس کا اثر بھی چھوڑا ہے اور یہ وہ نظریہ ہے جس کا دامن موت کے بحران سے بندھا ہوا ہے۔ کوئی متوازن نقطۂ نظر تلاش کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ

زندگی اور موت دونوں کو اپنایا جائے۔ خود زندگی بھی شادی وغم، گناہ اور مصائب کے تانے بانے سے بنتی ہے۔ مذہب کے وسیع نقشے میں انسان کو اس حقیقت کا عرفان حاصل ہوتا ہے کہ وہ موت کی کنہ کو صرف ترکِ علائق اور ایثار پیشگی کے پس منظر میں سمجھ سکتا ہے۔ لہٰذا اگر مذہب انسان کو ضروریات اور خواہشوں کا محدود رکھنا اور اُن پر قابو پانا نہ سکھاتا تو وہ علائق میں اسیر ہو کر رہ جاتا اور اس طرح اپنے ارتقاء اور حقیقی آزادی کے حصول کی صلاحیت کھو بیٹھتا۔ یہ سب کسی ایک مخصوص مذہب کی دین نہیں ہے بلکہ انسان کی زندگی کو مالا مال کرنے میں مجموعی طور پر ''مذہب'' کا حصہ ہے اور مذہب کی یہ تحریک جوں جوں بڑھتی رہی ہے اس نے ہمیں انسان کے تجربات، خواہشات اور امکانات کو سمجھنے کے لیے جدید تر اور بعض اعتبار سے زیادہ گہری بصیرت عطا کی ہے۔ انسان کی زندگی پر اپنا پورا اثر ڈالنے سے مذاہب کو اس رجحان نے روکے رکھا کہ وہ اپنے چاروں طرف حفاظت اور علاحدگی پسندی کی دیواریں کھڑی کر کے اپنی جداگانہ اور ایک دوسرے سے حسد کرنے والی مملکتیں بناتے گئے، جنھیں اپنی بہبودی کی سوچنے سے زیادہ دوسری مملکتوں کو نیچا دکھانے کی فکر رہی۔ ان منافقتوں نے تاریخ کا چہرہ بھی مسخ کیا ہے اور یہ جھگڑے مختلف مذہبوں ہی میں نہیں بلکہ ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں کے درمیان بھی رہے ہیں۔

جہاں تک اسلام کا معاملہ ہے دوسرے تمام مذاہب میں صداقت کے عنصر کا اعتراف کرنا صرف سمجھداری یا رواداری کا مظاہرہ ہی نہیں بلکہ حقیقت میں ایک مذہبی حکم ہے جسے ایک مسلمان اپنے روحانی نقصان کی قیمت پر نظر انداز کرتا ہے یا اس سے روگردانی کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ قرآن اور حدیث میں اس کا بار بار ذکر کیا گیا ہے کہ خدا نے تمام قوموں کی طرف انبیاء مبعوث کیے تھے جن میں سے صرف بعض کا نام لیا گیا ہے اور بہتوں کا نام نہیں آیا ہے۔ نیز یہ کہ پیغمبر اسلام اِن انبیائے سابقین کی تکذیب کرنے نہیں آئے تھے بلکہ ان کے پیغام اور تعلیمات کی تصدیق وتوثیق کے لیے بھیجے گئے تھے۔ ان کا احترام اور تمام مذاہب کی عبادت گاہوں کا احترام ہر مسلمان پر واجب کیا گیا ہے۔

بعض حالات میں کچھ فرماں رواؤں یا فاتحوں نے جو کچھ بھی کیا ہو اسلام میں غیر مذہب کے ماننے والوں بلکہ منکرین مذہب کی بھی کسی طرح توہین یا اُن سے بدسلوکی کی قطعاً اجازت نہیں ہے، اگرچہ اسلام سختی سے توحید پرست مذہب ہے اور شرک پرستی کا شدت سے مخالف ہے مگر اپنے پیروؤں کو

اُس نے یہ حکم دیا ہے:

وَلاَ تَسُبُّواْ الَّـذِيْنَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللّهِ فَيَسُبُّواْ اللّهَ عَدْواً بِغَيْرِ عِـلْـمٍ كَـذَلِكَ زَيَّـنَّـا لِـكُـلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَى رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ.([لِ عمران:۱۰۸]

اور (اے مسلمانو!) تم انھیں گالیاں نہ دو جن کو یہ لوگ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں کیوں کہ پھر یہ لوگ جہالت کی بناء پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں گے۔ ہم نے اسی طرح ہر امت کے لیے اُس کے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے۔ پھر اُن کو اپنے رب ہی کی طرف پلٹ کر آنا ہے۔ اس وقت وہ اُن کو بتا دے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں۔

پھر یہ لوگ خدا کی توہین کریں تو مسلمان جو خود اُن کے معبودوں کو بُرا کہتے ہیں اس بات پر بگڑنے میں حق بجانب نہیں ہو سکتے۔ کوئی مسلمان خواہ اُس کا دنیوی مذہبی رتبہ کتنا ہی بلند ہو، اگر ان ہدایات کی خلاف ورزی کرتا ہے تو گویا وہ اپنے مذہب کی تعلیمات کی صریح نافرمانی کرتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے وہ اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور غور کریں کہ وہ فکر انسانی کو روشن تر بنانے، باہمی مفاہمت کو فروغ دینے، اور بھائی چارے کا احساس پیدا کرنے میں واقعی مدد کر رہے ہیں؟ یہی وہ اعلیٰ مقاصد ہیں جو اسلام کو روزِ اول سے عزیز رہے ہیں۔

مزید برآں— مختلف مذاہب کے درمیان اقدار اور نظریات کے تبادلے کے امکانات کو محدود کرنا یا ایک ہی مذہب (یا رنگ و نسلس یا قوم و قبیلہ) کے پیروؤں کے درمیان مکالمے پر پابندی لگانا انسان کے روحانی ارتقاء کی رفتار میں سخت رکاوٹ کا باعث ہے۔ ایسی پابندیاں خیالات عقائد اور آراء کے بہاؤ کو روکتی ہیں اور ان سے ذہنی تجسس کا وہ ارتقاء بھی رُک جاتا ہے جو تلاشِ حق کے لیے اکساتا ہے اور خیالات کی پراگندگی کو ختم کرتا ہے۔

ہمارے عہد میں جبکہ صرف اشیاء اور اشخاص ہی کے لیے نہیں بلکہ علوم اور نظریات و افکار اور ہر میدان کے تخلیقی کارناموں کو بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے وسائل خاصے تیز اور موثر ہیں، یہ تنگ نظری اور بھی زیادہ قابلِ اعتراض ہو جاتی ہے۔ تجدد کے مخالفین افکار و اعمال کے بہت سے

میدانوں میں جو دیواریں کھڑی کر رہے ہیں آج کے زمانے میں اُن کا کوئی جواز نہیں ہوسکتا۔ (مثال کے طور پر دیکھیے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان باہمی مفاہمت اور رسل ورسائل کی دشواریاں برابر بڑھتی جارہی ہیں۔صرف سیاسی معاشرتی اور اقتصادی سطح پر ہی لین دین بند نہیں ہوا ہے بلکہ رسالوں، کتابوں یا شاعروں اسکالروں اور کھلاڑیوں کی آمد ورفت سے مذہبی اور ثقافتی میدان میں جو تبادلہ ہوتا تھا وہ بھی بند ہو چکا ہے۔ مجھے تو ایسا واسطہ نہیں پڑا، کسی اور کے سامنے بھی یہ منطق شاید کبھی پیش کی گئی ہو کہ ایک دوسرے کے افکار ومسائل اور طور طریق سے بے خبری قومی تحفظ کو مضبوط بنا سکتی ہے۔)

لہٰذا ہمیں اپنے دل ودماغ کی کھڑکیاں اور دروازے ہر اس بات کے لیے کھلے رکھنے چاہئیں جس سے زندگی مالا مال ہے، یعنی ہمارے خیالات اور قدریں ہماری سائنس اور آرٹ، ہمارا فلسفہ اور عقائد، خواہ وہ ہمیں کسی بھی مصدر سے ملیں، ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مبارک فرمان پر کہ "**الحکمۃُ ضَالّۃُ المُؤمن فلیاخُذھَا أینَ وَجَدَھا**" (دانائی کی ہر بات مومن کی متاعِ گم شدہ ہے جہاں بھی ملے اُسے حاصل کرلے) اور "**اُطلُبوا العِلمَ ولَو بالصِّین**" (طلب علم کروخواہ وہ چین میں ملے) سچے دل سے عمل کر کے اسے اپنے اعمال میں رچا بسا لینا چاہیے، صرف زبان سے اقرار کر لینا کافی نہ ہوگا۔

مذہب کی دنیا میں بھی جہاں لوگ اکثر ضرورت سے زیادہ متعصب یا تحفظ پسند ہو جاتے ہیں ہمیں محسوس کرنا چاہیے کہ اگر ہم دوسرے مذاہب کے صحت مند تصورات کا خوش دلی سے استقبال کرنے کو آمادہ رہیں تو اِس سے ہمارے اپنے مذہب کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوگی کیوں کہ آخر دوسرے مذاہب کا سرچشمہ بھی ذات خداوندی ہی ہے۔ عام طور پر مدرسہ ہائے فکر ہوں، یا فلسفہ وعقائد کے دبستان یہ اتنے بودے اور شکی ہوتے ہیں کہ اپنے غیروں کے خیالات وعقائد سے میل جول بڑھانے سے ڈرتے ہیں اُن کا عام رجحان محدود اور بند ہو کر رہنے کا ہے اور وہ دوستانہ مکالمہ یا تقابل کو پسند نہیں کرتے کیوں کہ اس سے انھیں اپنے انداز نظر میں تبدیلی پیدا ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے یا اس طرح کچھ ایسے نئے سوالات سامنے آسکتے ہیں جو ان حضرات کو ناگوار گزریں جو حق کے تنہا اجارہ دار ہونے کا دعویٰ رکھتے ہوں۔ یہ حضرات حق پر ہونے کا دعویٰ ضرور کریں مگر انھیں یہ حق نہیں کہ شبہات اور سوالات کو پیدا نہ ہونے دیں۔ یہ رویہ سماجی اور طبیعی علوم میں معقول نہیں سمجھا جاتا تو اسے مذہب یا فلسفے میں کیوں معقول سمجھا جائے؟

کسی زندہ اور نامیاتی مذہب کو اس کی حمایت نہیں کرنی چاہیے لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ اسلام دوسرے مذاہب سے یا جدید افکار سے ایک بار آور مکالمے کی ابتداء نہ کرے۔ ان میں سے بعض افکار کو وہ قبول کرسکتا ہے بعض کو ردّ کرسکتا ہے مگر بشمولِ اسلام اگر کوئی مذہب بھی اچھی طرح سمجھے پرکھے بغیر اِن افکار کو ردّ یا قبول کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو یہ کوئی دانائی کی بات نہیں ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ اسلام کے پاس عصر حاضر کو دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔ اسے اپنے پیروؤں کے سامنے بھی اپنی تعلیمات کو دانش مندی کے ساتھ پیش کرنا چاہیے اور انھیں انسان کی فکری میراث کے مشترک خزانے میں بھی اضافہ کرنا چاہیے۔ اِس طرح اگر دوسرے مذاہب کے مردوزن شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلام کے کچھ اصول ونظریات کو اپنے افکار میں جذب کرسکیں، جیسا کہ تاریخ کے ارتقاء میں ہوا بھی ہے تو کیا خدا کے مقصدِ ہدایت میں اس کی کچھ اہمیت ہوگی کہ وہ لوگ اُن نظریات کے اصل مصدر اور ماٰخذ کا اعتراف بھی کرتے ہیں یا نہیں۔

اسی طرح اگر اس بات کی صحیح ترجمانی ہو کہ عہد حاضر کے سامنے مذہب کو کس طرح پیش کیا جائے اور اس کی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے کن قدروں پر زیادہ زور دیا جائے اور دوسرے مذاہب اور ان کے رہنماؤں کے تجربات مسلمانوں کے تجربے میں کچھ اضافہ کرنے والے ہوں، تو اس کا بھی کھلے دل سے استقبال ہونا چاہیے نہ یہ کہ اسے حقارت سے ٹھکرایا جائے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ایک بار کہا تھا کہ: ''جو ملاتا ہے وہ دھرم ہے جو توڑتا ہو وہ اَدھرم ہے۔'' اور اسلام کا عظیم ورثہ یہی ہے کہ اس نے امن واتحاد اور ساری نوعِ انسانی سے ہمدردانہ تعلق رکھنے پر زور دیا ہے۔

جو اعداد وشمار دستیاب ہوئے ہیں اُن کی رُو سے ۱۹۶۸ء میں مسلمانوں کی آبادی ساری دنیا میں کم از کم ۴۷ کروڑ ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانکا اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن[11] کی تصنیف ''اسلام'' کی رُو سے یہ تعداد کم از کم ۵۰ کروڑ ہوتی ہے۔ اگر عیسائیوں کے تمام فرقے کیتھولک پروٹسٹنٹ اور راسخ العقیدہ مشرقی چرچ وغیرہ کو ملا کر دیکھا جائے تو عیسائیوں کے بعد مسلمانوں کا نمبر ہے۔ باعتبار تناسب یہ دنیا کی کل آبادی کا بہت بڑا حصہ ہے اور دوسری بہت سی اہم وجوہ کے علاوہ مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ ساری دنیا کا فائدہ اسی میں ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کا ہمدردانہ مطالعہ کیا جائے اور انھوں نے انسانیت اور فکر وتہذیب کے ارتقاء کے لیے، یا زمین پر زندگی کا ماحول صالح بنانے کے لیے جو کچھ کیا ہے یا کرنے کی

صلاحیت رکھتے ہیں اُس کا اعتراف کیا جائے۔ (میں یہی بات اجمالاً دنیا کے دوسرے تمام مذاہب کے لیے بھی کہتا ہوں) اسی طرح مسلمانوں کا مفاد اس میں ہے کہ وہ دوسرے عالمی مذاہب پر غور کریں کہ انھوں نے دنیا کو بالفعل کیا دیا ہے اور بالقوۃ کیا دے سکتے ہیں۔

انصاف، ہمدردی اور ہر اہم اور حیات بخش چیز کی قدر و قیمت کا اعتراف کرنے کے لیے آمادگی کا ایسا رویہ زمین پر امن و آشتی کی ضمانت کے لیے کافی نہیں تو یقینی ضرور ہے کیوں کہ اس کا افسوسناک حد تک فقدان ہے۔ ایسے لوگ خاصی بڑی تعداد میں ہیں جو مختلف مذاہب میں ناروا داری تعصب اور رسّا کشی کو خوبی کی بات سمجھتے ہیں وہ اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے یا منشائے الٰہی کی صحیح ترجمانی کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ یہ تو برہما، گاڈ، یزداں، یا اللہ کا بہت ہی پست تصور ہوگا کہ ہم اس ذاتِ بے ہمتا سے ایسے مقصد و منشاء کو منسوب کرنے لگیں جسے کوئی مہذب انسان بھی اپناتے ہوئے شرم محسوس کرے گا۔

حوالہ جات

۱۔ ہمدانی (سید علی) ذخیرۃ الملوك ورق ۹۴، الف ۹۵، الف مخطوطہ ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔
۲۔ اقبال، ضرب کلیم، لاہور ۱۹۳۶ء (نظم بعنوان ''کافر و مومن'')
۳۔ اقبال، بالِ جبریل (نظم بعنوان: ''مرید ہندی و پیر رومی'')
۴۔ الدنیا مزرعة الآخرة (دنیا آخرت کی کھیتی ہے)
۵۔ المتقی الہندی (علاء الدین علی) کنز العمال، ج: ۳، صفحات ۱۳-۱۲
دائرة المعارف الاسلامیه، حیدرآباد، ۱۹۵۱ء
۶۔ اقبال، بالِ جبریل، ص: ۱۹۶ء لاہور، ۱۹۴۶ء
۷۔ گرونیام (جی آئی، وان) میڈیول اسلام، ص: ۱۷۷ (دی یونیورسٹی آف شکاگو پریس، ۱۹۵۳ء
۸۔ موریس (چارلس) پاتھس اوف لائف (جارج برزلر، نیویارک، ۱۹۳۶ء)
۹۔ حالی (مولانا الطاف حسین) کلیات نظمِ حالی (اردو) مرتبہ: محمد اسماعیل پانی پتی امرتسر ۱۹۲۴ء ص: ۱۶۶
۱۰۔ مفورڈ (لیوس) کنڈکٹ اوف لائف (سیکر اینڈ وار برگ، لندن ۱۹۵۲ء)
۱۱۔ فضل الرحمٰن (ڈاکٹر) اسلام، ص: ۱، ویڈنفلڈ اینڈ نکلسن، لندن ۱۹۶۶ء

(ماخوذ: اسلام اور عصر جدید [اپریل ۱۹۷۷ء] جلد: ۹، شمارہ: ۲)

[.....جاری.....]

محمد لعل چاند شیخ *

جدید تعلیم کی اہمیت ومعنویت

(شاہ عبدالعزیز کے فتاویٰ کی روشنی میں)

شاہ عبدالعزیز کا تاریخی نام ''غلام حلیم'' ہے۔ان کا شمار ہندوستان کے ان افراد میں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنے علم وحکمت اور اخلاق وکردار سے ایک جہاں کو متاثر کیا۔ ان کی ولادت ۱۱۵۹ھ بمطابق ۱۷۴۶ء دہلی میں ہوئی، وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی دوسری اہلیہ[1] سے سب سے بڑے بیٹے تھے۔شاہ عبدالعزیز نے تقریباً ۷۹ سال کی عمر پائی، اور ۱۸۲۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔شاہ عبدالعزیز کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے تقریباً ۱۵۰ علوم کا مطالعہ کیا تھا، ان میں نصف علوم سابقین اولین کے تھے اور نصف اس امت اسلامیہ کے، جن میں مذہبی علوم کے علاوہ ہیئت، ہندسہ، مناظرہ، اصطرلاب، منطق وغیرہ شامل ہیں۔[2] وہ اپنے والد کی علمی ودینی خدمات کے امین تھے اور انھیں فروغ دینے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔[3]

شاہ عبدالعزیز کی زندگی ہندوستان میں سیاسی انتشار کے زمانہ میں گزری۔مغلیہ حکومت کے آخری طاقت ور حکمراں اورنگزیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد نااہل اور سیاسی بصیرت سے بے بہرہ حکمرانوں کی وجہ سے مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں، روہیلوں، ایرانی وتورانی کشمکشوں اور انگریزی

☆ ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵ ای میل:mdlalchand.jmi@gmail.com

شورشوں نے عظیم مغلیہ سلطنت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ دہلی سکھوں اور مرہٹوں کی چھاپہ ماری سے عاجز ہو چکی تھی، اس کے تدارک کے لیے شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی مگر شاہ عالم کی کم ہمتی اور کوتاہ نظری کی وجہ سے کامیابی نہیں مل سکی۔ علاوہ ازیں بادشاہوں کی بداعمالیوں، عیاشیوں اور آپسی بغض وحسد کی بنا پر ملک میں بےچینی اور معاشی ومعاشرتی بدحالی عام ہوگئی تھی۔ اس پرآشوب ماحول میں سماجی حالات کی اصلاحی ذمہ داری جن علما نے لی ان میں شاہ عبدالعزیز کی شخصیت مرکزی حیثیت کی حامل ہے۔ ان کے اندر دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ سیاسیات اور اقتصادیات کے آپسی تعلقات وغیرہ کی دینوی فہم وادراک بھی انتہائی درجے کے تھے۔[۴] ان خراب سیاسی حالات کا فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے بنگال، بہار اور اڑیسہ پر قبضہ جما لیا تھا، حتی کہ ۱۷۶۵ء میں مغلیہ حکومت نے ان تینوں صوبوں کی دیوانی بلا شرکت غیرے بطور انعام کمپنی حکومت کو دیدی تھی۔ انگریزی حکومت نے اس کے بعد من مانی طور پر پورے ہندوستان کو ظلم وجبر کے ساتھ قبضہ کرنا شروع کیا اور خصوصا مسلمانوں کو اپنا سیاسی دشمن اور ہندوؤں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اپنا دوست بنالیا۔ شاہ عبدالعزیز نے ظلم وجبر والی اس انگریزی حکومت پر تنقیدیں بھی کیں۔ انھوں نے اپنی جرأت و ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعلانیہ طور پر ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا نہ صرف فتوی دیا، بلکہ جہاں کہیں بھی انگریزوں کے خلاف کوئی مہم جوئی ہوتی، اس سے اپنی ہمدردی کا اظہار کرتے اور خط وکتابت کرنے سے بھی گریز نہ کرتے۔[۵] وہ لکھنؤ کی ریاست اودھ اور ریاست رامپور کو بھی دارالحرب مانتے تھے۔[۶]

ان کی اصلاحی کوششوں میں فروغ تعلیم کی کوششیں علاحدہ امتیاز رکھتی ہیں۔ ان کی عظمت کا اندازہ ان کی تصانیف سے کہیں زیادہ ان کی درس وتدریس اور ارشاد وہدایت سے ہوتا ہے۔[۷] دینی تعلیم میں بھی انہوں نے حصہ لیا اور عام درس وتدریس کے ساتھ ساتھ اپنی تقریر وتحریر کے ذریعہ عوام الناس کی اصلاح وتربیت کا کام کیا۔ جدید تعلیم کی ضرورت واہمیت کے پیش نظر اس کے حصول کا اس وقت فتوی دیا جس وقت ملک بھر میں اس کی حرمت کا عام فتوی جاری تھا۔[۸] یہ ان کی دوراندیشی اور عمیق فکر کو اجاگر کرتی ہے۔ ملک کے سیاسی ومعاشرتی حالات کے جائزہ کے بعد انھیں یقین ہونے لگا کہ انگریزوں سے جنگ جیتنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ (کیوں کہ خود مسلمان نوابین انگریزی حکومت کے پینشن پر گزارہ کرنے سے خوش ہو رہے تھے، اور مسلمانوں کی تعلیمی، سیاسی اور اقتصادی حالت انگریزی حکومت کے ساتھ مل کر

کام نہ کرنے سے بدتر ہوتی جا رہی تھی) ایسے میں انھوں نے عوام الناس کو جدید تعلیم حاصل کرنے اور انگریزی حکومت کی ملازمت اختیار کرنے کا فتویٰ جاری کیا۔ اس مقالے میں جدید تعلیم کے حوالے سے ان کے فتاوی کے مجموعے ''فتاوی عزیزی'' کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

فتاوی عزیزی

''فتاوی عزیزی'' فارسی زبان میں شاہ عبدالعزیز کے فتووں کا مجموعہ ہے۔ یہ فتوے ان کے تبحر علمی اور بلندی فکر کا نچوڑ اور دینی و دنیاوی معلومات کا وقیع سرمایہ ہیں۔ اس تصنیف میں وہ بہ یک وقت ایک فقیہ، صوفی، متکلم، مفسر، محدث اور مفکر کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کے وسیع پیمانے پر سوالوں کے جوابات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب عقائد، تفسیر و تشریح، تصوف، سیاست اور فقہی موضوعات کے علاوہ چند رسائل پر مبنی ہے۔[9] ان سے دریافت کیے گئے سوالات میں سے چند سوال جو جدید تعلیم اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہیں آئندہ سطور میں انھیں کی روشنی میں بحث کی جائے گی۔

انگریزی زبان

شاہ عبدالعزیز زمانے کے نباض اور اس پر گہری نظر رکھنے والے عالم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں بدلتے حالات کے تناظر میں شریعت اسلامیہ کے دائرے میں رہتے ہوئے اس کی قبولیت اور اخذ کی بابت لچک بھی پائی جاتی ہے۔ ان کی کتابوں کے مطالعے سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے مثلاً انگریزی زبان کے سیکھنے سکھانے کے حوالے سے ان کے یہاں لچک پائی جاتی ہے، حالاں کہ اسی زمانے میں علماء کا ایک بڑا طبقہ شدت سے اس کی مخالفت پر مصر تھا۔ چنانچہ اس حوالے سے مرقوم ہے کہ ایک دفعہ شاہ بخارا نے شاہ عبدالعزیز سے ''فتاوی سراج المنیر'' مصنف تاج محمد مفتی کی ایک عربی عبارت:

> **''تعلم العلم يكون فرض عين وهوقدر ما يحتاج اليه و فرض كفاية وهو ماناد عليه لينفع غيره و مندوب وهو التبحرفی الفقه و حرام وهوعلم الفلسفة و الشعبدة والتنجيم و الرمل و علم القائفين والسحر دخل فی الفلسفة وعلم المنطق.''**

بقدر ضرورت علم حاصل کرنا فرض ہے، اور کسی کی نفع رسانی کی غرض سے اس سے زیادہ حاصل کرنا فرض کفایہ ہے۔ اسی طرح فقہ میں مہارت حاصل کرنا مندوب ہے، اور مندرجہ ذیل علوم حرام ہیں: علم فلسفہ، شعبدہ، نجوم، رمل، قیافہ شناسی، جادو اور فلسفہ میں علم منطق بھی شامل ہے) نقل کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا منطق اور انگریزی اور ساتھ ہی وہ فارسی جو قرآن وحدیث کے علاوہ ہے، پڑھنا جائز ہے؟ اس سوال کا ایک جزو عیسائیوں کی نوکری حاصل کرنے کے سلسلے میں تھا۔ اس سوال کے تمام جزئیات یعنی منطق، انگریزی زبان اور عیسائیوں کی نوکری کا انھوں نے بالترتیب تشفی بخش جواب دیا۔[۱۰]

شاہ عبدالعزیز نے پہلے کہا کہ نہ منطق اور نہ ہی انگریزی زبان سیکھنے میں کوئی قباحت ہے۔ انھوں نے لکھا کہ انگریزی کوئی علم مقصود بالذات نہیں ہے؛ بلکہ یہ علم آلہ ہے، جیسے: صرف ونحو، اس صورت میں آلہ کی حلت وحرمت ذی آلہ کے حلت وحرمت کے موافق ہوتی ہے۔ مثلاً: آلات جنگ وجدال، گھوڑا، توپ خانہ اور اسلحہ خانہ وغیرہ بذات خود کوئی خراب چیز نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے ذریعہ کفار کے ساتھ جہاد کرنا، چوروں اور ڈاکوؤں کو دفع کرنا ناجائز ہے، بلکہ ان کے ذریعہ بغاوت کرنا، ڈاکہ ڈالنا، فساد پھیلانا، ناحق کسی چیز پر قبضہ جمانا حرام ہے۔ گویا اس کا استعمال حرام یا حلال کا سبب بنتا ہے نا کہ وہ بذات خود حلال یا حرام ہے۔ ایسا ہی ہر حال میں جو حکم ذی آلہ کے بارے میں ہوگا، وہی حکم آلہ کے بارے میں بھی ہوگا۔ بہر حال شاہ عبدالعزیز غایت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر کوئی شخص انگریزی سیکھے اور اس کے ذریعہ مذاہب باطلہ اور عقائد فاسدہ کی تائید اور صحیح عقائد میں شک وشبہ پیدا کرے تو وہ شخص اپنے فعل کی وجہ سے مجرم قرار پائے گا صرف تحصیل علم کی وجہ سے گنہ گار نہیں ہوگا۔ اگر کوئی شخص انگریزی زبان کو ہی صرف مقصود بالذات بنالے اور تمام عمر اسی میں مشغول ومصروف رہ کر زندگی گزار دے اور مسائل شرعیہ سے جو کہ مقصود بالذات ہیں، بے بہرہ رہ جائے تو وہ علوم آلیہ بھی حرام اور ممنوع

ہے۔ایسی حالت میں صرف ونحو،معانی اور بیان وغیرہ بھی اس زمرے میں
آجائیں گے۔''

انھوں نے انگریزی زبان کے سلسلے میں یہ بھی عرض کیا ہے کہ انگریزی پڑھنے کا مطلب انگریزی کا حرف پہچاننا،اسے لکھنا اور اس کی لغت واصطلاح جاننا ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔اوراسے مباح قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابتؓ کو حکم دیا تھا کہ وہ یہود ونصاریٰ کی زبان اور ان کے خط وکتابت کا طریقہ سیکھیں تا کہ ان کی جانب سے آنے والے خطوط کا جواب دیا جا سکے۔اس کے ذریعہ خوشامد، اختلاط اور تقرب حاصل کرنا حرام اور مکروہ ہے۔[۱۱]

زبان دانی کے حوالے سے بھی شاہ عبدالعزیز کے یہاں وسعت پائی جاتی ہے۔عموماً عجمی علماء بہ یک وقت کئی زبانوں کے ماہر ہوتے ہیں،ان میں عربی کے علاوہ کئی علاقائی و بیرونی زبانیں بھی شامل ہوتی ہیں۔شاہ عبدالعزیز کو بھی عربی، فارسی،اور اردو پر اچھی مہارت حاصل تھی۔اس کے علاوہ انھوں نے اپنی آخری عمر میں عبرانی (حبرو) بھی سیکھی تھی۔قصہ کچھ یوں ہے کہ اس دوران ایک شخص دہلی میں سکونت پذیر تھا،اس سے عبرانی اور توریت کا کچھ حصہ پڑھا۔مناظر احسن گیلانی (۱۹۵۶-۱۸۹۲ء) لکھتے ہیں:

''مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۸۸۰-۱۸۳۳) انہی کی نقش قدم پر چلتے ہوئے حج سے واپسی کے دوران انگریزی سیکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔دراصل حج سے واپسی کی سفر میں ان کی ملاقات ایک انگریز سے ہوئی، انگریز نے اسلام سے متعلق سوالات کئے،جن کا جواب مولانا محمد قاسم نے ایک مترجم کے ذریعہ دیا۔اس سے انگریز بہت زیادہ متاثر ہوا اور مولانا محمد قاسم کو ایسا لگا کہ وہ اسلام قبول کرلیں گے۔اس کیفیت کو دیکھ کر مولانا نے یہ محسوس کیا کہ اگر یہ باتیں وہ انگریزی میں کرنے کے اہل ہوتے تو وہ انگریز کو مزید متاثر کرپاتے۔''

مولانا مناظر احسن گیلانی مزید اپنی تخیلات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر مولانا قاسم کی زندگی نے مہلت دی ہوتی اور وہ انگریزی سیکھ لیتے تو دارالعلوم دیوبند اور پورے برصغیر ہند کے مسلمانوں کی معاشرتی حالت کچھ اور ہی ہوتی۔''

وہ یہ بھی لکھتے ہیں:

''انھیں علماء کی جانب انگریزی سیکھنے کی حرمت کے فتوی کو منسوب کیا جاتا ہے جو کی سراسر غلط اور ناانصافی پر مبنی ہے۔''[۱۲]

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ برصغیر میں انگریزی سے علماء میں کیوں دوری دیکھی گئی۔ دراصل انگریزی زبان سے مسلمانوں کی نفرت کی کئی ایک وجوہات رہی ہیں، ان میں ایک یہ کہ مسلمانوں میں سے ایک بڑا طبقہ انگریز اور انگریزی زبان کو اسلام کے خلاف گردانتا تھا۔ ان کی نفرت انھیں کے ترقی کے راستے میں رکاوٹ تھی۔ سرسید احمد خاں، نواب عبداللطیف خاں اور دیگر دور بیں دانشمند چاہتے تھے، کہ مسلمان اس نفرت سے ابھریں اور انگریزی زبان سیکھنے اور اس کی تعلیم حاصل کرنے پر توجہ دیں۔[۱۳] اس کی ترغیب دلانے کے لیے سرسید نے یہ استدلال پیش کیا کہ جس زمانے میں جس قوم کی حکومت ہوتی ہے، اس زمانے میں اس کی زبان اختیار کی جاتی ہے۔ اور جس ملک میں جو زبان حکومت کی ہوتی ہے، اس ملک میں اسی زبان کا عروج ہوتا ہے۔ عوام الناس اسی کو اختیار کرتے ہیں۔ عہد بنوامیہ اور بنوعباسیہ میں عربی زبان کا عروج تھا اور ہر شخص اس زبان کو سیکھنا چاہتا تھا۔ ہندوؤں کے زمانے میں سنسکرت کا عروج تھا، لہٰذا لوگ اسی کو اختیار کرتے تھے۔ جب مسلمانوں کی ہندوستان پر عمل داری ہوئی تو فارسی زبان کو وسعت ملی۔ سب نے فارسی زبان میں تعلیم حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اب ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت ہے۔ اس کی زبان انگریزی ہے اور اسے ہی عروج حاصل ہے۔ تو ماسوائے مسلمانوں کے سب نے انگریزی زبان اختیار کر لی ہے۔[۱۴]

علوم جدیدہ اور سرکاری ملازمت

سرسید لکھتے ہیں:

''علوم جدیدہ یا جدید تعلیم وہ ہیں جو متقدمین یونانیہ اور حکمائے اسلامیہ کے

زمانہ میں بالکل نہیں تھے اور اب حال میں ایجاد ہوئے ہیں، مثلاً: جیالوجی اور الیکٹری سیٹی وغیرہ یا یہ کہ وہ علوم غلط اصول پر تھے اور اب اسے صحیح کیا گیا ہے، جیسے علم ہیئت اور کمسٹری وغیرہ یا وہ علوم جو زمانۂ قدیم سے آج بھی ویسے ہی ہیں، مگر اسے کمال حاصل ہوگیا ہے، مثلاً: علم آلات اور علم الحساب وغیرہ، لہٰذا ان میں سے ایک یا کل مجموعہ کو علوم جدیدہ یا جدید تعلیم کہہ سکتے ہیں۔''[۱۵]

انگریزی حکومت ابتدائی دور میں اسی مصداق کے موافق تعلیم فروغ دے رہی تھی۔ ہندوستانی تناظر میں جدید تعلیم آہستہ آہستہ عیسائی مشنریوں کے ذریعہ شروع کی گئی اس نظام تعلیم جدید کو کہا جانے لگا، جس میں ابتداً پرتگالی پھر انگریزی زبان میں عیسائی مذہبی تعلیم، مغربی تہذیب وتمدن اور سائنسی علوم کی درس وتدریس شامل تھی۔ تعلیم کا یہ نظام ابتدائی ادوار میں انگریز حکام کے بچوں تک محدود تھی، پھر اینگلو انڈین بچوں کو اس میں داخل کیا گیا اور پھر ہندوستانیوں کو اپنا پیرو بنانے کے لیے تعلیم کو ایک حربہ کے طور پر استعمال کیا گیا جس میں ہندوستانی بچوں کو بھی شامل کرلیا گیا۔[۱۶] جدید تعلیم سے مراد وہ علوم ہوگئے، جن کی معنویت حکومت کی جانب سے ثابت تھی۔ بعض مؤرخین نے انھیں علوم حاضرہ سے بھی تعبیر کیا ہے۔[۱۷]

شاہ عبدالعزیز کے فتاویٰ سے سرسید احمد خاں کی اصطلاح کی تائید ظاہر ہوتی ہے۔ سید احمد نے لکھا ہے:

''۱۸۵۷ء کی جنگ کے پیچھے ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ کمپنی مسلمانوں کی صحیح تعلیم وتربیت کی جانب کوئی توجہ مبذول کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔[۱۸] شاہ عبدالعزیز نے انگریزی زبان کو جدید تعلیم کا آلہ اور فارسی کا مساوی زبان قرار دیا ہے۔۱۷۹۲ء میں جب دلی کالج قائم ہوا تو مسلمان اپنے بچوں کو جدید تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجنے کو تیار نہیں تھے۔ اس دوران انھوں نے کہا کہ اگر یہ علوم حاصل کر کے کوئی پل بناتا ہے یا لوگوں کی آسانی کے لیے راستے تعمیر کرتا ہے وغیرہ تو یہ علوم حاصل کرنا جائز ہے۔ اسی طرح

انھوں نے انگریزوں کی نوکری کرنے کو بھی مختلف انبیاء کے عملی زندگی سے جائز قرار دیا ہے۔''[۱۹]

انھوں نے مزید لکھا ہے:

''عیسائیوں یا کسی بھی غیر مسلم کے یہاں نوکری کرنے کی کئی ایک قسمیں ہیں: بعض مباح، بعض مستحب، بعض حرام اور بعض گناہ کبیرہ قریب کفر کے ہے۔''

اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مباح اس وقت ہوگا جب نوکری رسوم صالحہ قائم کرنے کے لیے دی گئی ہو، اور ایسا کام ہو کہ اس کا سرانجام بہتر ہو جیسے چوروں اور ڈاکوؤں کو دفع کرنا، عدالت میں شرع کے مطابق فتویٰ دینا، لوگوں کے آرام کے لیے پل بنانا اور عمارتیں تعمیر و مرمت کرنا یا اسی طرح عام لوگوں کو فائدہ پہنچانے والا کام کرنا۔ اس کی دلیل حضرت یوسفؑ کا بادشاہ مصر سے درخواست کر کے مصر کے خزانہ کا داروغہ مقرر ہونا، جبکہ بادشاہ مصر کافر تھا۔ اس نوکری کا مقصد عدل وانصاف کو فروغ دینا تھا۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ کی والدہ کا فرعون کے یہاں نوکری کرنا تاکہ حضرت موسیٰؑ کو دودھ پلایا جا سکے۔ اگر کوئی شخص اس کے بجائے غیر مسلموں کے یہاں نوکری کرے اور کرتے وقت ان سے اختلاط لازم آئے یا نوکری کے دوران رسوم اور امور حکومت خلاف شرع دیکھنا پڑے اور مسلمانوں کے خلاف ظلم میں اعانت شامل ہوں، مثلاً: کتابت، خدمت گاری یا سپاہی کا کام یا اس نوکری میں حد سے زیادہ غیر مسلموں کی تعظیم کرنا پڑے اور ان کے سامنے بیٹھنے اور کھڑے ہونے سے اپنے کو ذلیل محسوس کرے تو ایسی نوکری حرام ہے۔ اگر کسی کو اس بات کی نوکری دی جائے کہ اسے کسی مسلمان کو قتل کرنا پڑے، کسی ریاست کو درہم برہم کرنا ہو یا بدعقیدگی کو بڑھانا ہو یا اسلام کی کمیاں تلاش کرنا ہو تو

ایسی نوکری نہایت کبیرہ گناہ ہے اور کفر کے قریب ہے۔''

کسی قاضی کا سوال تھا کہ انگریزوں کی نوکری کرنا جائز ہے یا نہیں؟

اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

''نوکری میں شراب، مردار اور خنزیر کا گوشت پہونچانا ہو تو یہ حرام ہے۔ اگر اس طرح کی کوئی منہیات نہ ہوں مثلاً: منشی گیری یا فوجی کی حیثیت سے قافلہ پہونچانا جائز ہے۔''

اسی طرح شاہ غلام علی[۲۱] کا خط جس میں انگریز حکومت میں مفتی کا عہدہ سنبھالنے سے متعلق سوال کے جواب میں لکھا:

اسی طرح کی بات تقریباً ہر مدرسہ سے سننے میں آ رہی ہے اور ابھی کچھ ہی دنوں قبل مولوی رعایت علی خاں مختار فرنگی نے لکھ کر بھیجا تھا کہ انھیں کوئی ایسا عالم چاہیے جو مرتشی (رشوت خور) نہ ہوں اور مسائل فقہ میں مہارت رکھتے ہوں۔ اس کے لیے عبدالعزیز نے پہلے ہی اس بات کی تلقین کی تھی کہ جس شخص کو بھیجوں گا اس کے اندر شریعت کی پیروی میں سستی نہیں آنی چاہیے اور فرنگیوں کے اختلاط سے بھی محفوظ رہنے چاہیے۔ ان تمام باتوں پر رضامند ہونے پر شاہ عبدالعزیز نے مولوی عبدالحئی[۲۱] کو روانہ کیا تھا۔ جب یہ فتویٰ دیا گیا تو لوگوں میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں کہ کیا یہ کفار کی مدد نہیں ہے اور اگر ہے تو کیا یہ جائز ہے۔ اسی طرح لوگوں کی یہ بھی پیشکش تھی کہ کفار کو مدد کرنے سے افضل ہے کہ انسان طریقت اختیار کر لے۔[۲۲]

اس کا جواب انھوں نے قرآن کی آیت سے دیتے ہوئے آیت نقل کی:

''و قال الملک ائتونی به استخلصه لنفسی فلما کلمه قال انک الیوم لدینا مکین امین. قال اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم.''[۲۳]

جب بادشاہ نے کہا کہ حضرت یوسف کو لے آؤ تا کہ میں اسے اپنا مقرب

بناؤں اور کہا کہ آج آپ ہمارے صاحب مرتبہ امانت دار ہیں، چنانچہ یوسفؑ نے کہا تو مجھے زمین کے خزانوں کے لیے مقرر کر دیجیے کیوں کہ میں بہترین نگہبان اور خوب جاننے والا ہوں۔انھوں نے اپنی بات کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے بیضاوی کی تفسیر نقل کی:

"فیه دلیل علی جواز طلب التولیة و اظهار انه مستعد لها والتولی من یدالکافر اذا علمانه لا سبیل إلی اقامة الحق والسیاسة إلی بالا ستظهار به" [۲۴]

اس آیت میں دلیل ہے کہ تولیت طلب کرنا یا اس کا اظہار جائز ہے، جب اقامت حق وسیاست اس کی مدد کے بغیر ممکن نہ ہوں۔

شاہ عبدالعزیز نے مندرجہ بالا باتوں کو شریعت کہا اور طریقت بیان کرتے ہوئے لکھا:

طریقت میں بھی کسب وتعلق جائز ہے۔شریعت میں کسب وتعلق حرام اس لیے نہیں ہے، کیوں کہ قضاۃ اور دیگر اہل کسب کو تلقین وطریقت جائز نہ ہوتی۔ چونکہ اکثر لوگ قضاۃ اور اہل کسب سے اولیاء کبار ہوئے ہیں اور مرتبہ کمال وتکمیل کو بھی پہنچے ہیں تو مبتدی کا کیا ذکر ہے کہ اس کے لیے کسب وتعلق حرام ہو۔مگر اس کے باوجود کوئی ترک وتجرید اختیار کرتا ہو تو یہ عزیمت ہوگی اور اس کے کچھ شرائط ہیں: کہ وہ شخص اہل وعیال والا نہ ہو، والدین زندہ نہ ہوں یا ایسے اقارب نہ ہوں کہ ان کی کفالت اس پے واجب ہو۔

اس جواب کے آخر میں لکھا:

"اگر کوئی غیر مسلموں کی صحبت، حدود اسلام کی پابندی میں سستی، غیر مسلموں خصوصا عیسائیوں کے رسم ورواج کی موافقت وخوشامد، کذب گوئی میں مبالغہ اور دیگر مقاصد کی حصولیابی کے لیے امراء کی سرخروئی حاصل کرنے میں مبتلا ہو اگر کوئی اور ذریعہ معاش موجود نہ ہو تو یہ نوکری حاصل کرنا مباح ہے اور یہ خلفاء، اولیاء اور اصحاب کا یہی طریقہ رہا ہے کہ

وہ یہودیوں کے بچوں کو بھی درس وتدریس دیتے تھے۔ اس طرح سے انھوں نے مولوی عبدالحئی سے جانے کی بات کہی۔[۲۵] ایک دفعہ کمپنی حکومت نے عبدالعزیز کو تفضّل حسین کی وساطت سے کلکتہ مدرسہ میں تدریسی خدمات کے لیے بلا بھیجا، اس دوران عبدالعزیز تنگ دستی کے دور سے گذر رہے تھے، مگر دہلی کو ان کی زیادہ ضرورت تھی جس وجہ سے وہ نہیں گئے تھے۔[۲۶] ایک دفعہ انھوں نے حلال روزی کمانے کے طریقوں کا جواب دیتے ہوئے پہلا طریقہ نوکری کا ذکر کیا تھا، مگر اس میں کفر، ظلم اور خلاف شرع باتوں کی اعانت سے منع کیا تھا۔[۲۷] اسی طرح وہ مشرکین ونصاریٰ کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور اکل وشرب کے بھی قائل تھے بشرطیکہ اس دسترخوان میں کوئی حرام یا مکروہ اشیاء نہ ہوں، ساتھ ہی رقص وسرور بھی نہ ہوں۔[۲۸] وہ کفار کے خاص شناختوں کے علاوہ عام چیزوں میں اشتراکیت پائے جانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔[۲۹] شاہ عبدالعزیز کفار سے دوستی کو جائز سمجھتے تھے۔[۳۰] بعض برطانوی افسروں مثلاً مسٹر ولیم فریزر سے ان کی دوستی بھی تھی، جب انھوں نے عبدالعزیز سے کہا کہ میں بحکم سرکار کے کابل جارہا ہوں تو انھوں نے پورے راستہ اور اس کے مشکلات کا ذکر کیا۔[۳۱] حالاں کہ اس زمانے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مباحثے زوروں پر تھے۔[۳۲]

خلاصۂ کلام

شاہ عبدالعزیز کے فتاوی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اصولاً انگریزی زبان اور جدید تعلیم جسے کمپنی حکومت کی کا تعاون حاصل تھا کے قائل تھے، مگر وہ مشنریوں کی سازشوں، مستشرقین کی گمراہیوں اور انگریزوں کی ناپاک کوششوں سے محتاط رہنے کو اولیت دیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جب وہ اصولاً انگریزی تعلیم اور جدید تعلیم کی بات کرتے ہیں تو اسے صراحتاً جائز قرار دیتے ہیں، جب اس کے دوسرے پہلو یعنی اسے فروغ دینے والوں کے مقاصد پر نظر ڈالتے ہیں تو احتیاط سے کام لینے کی جانب اشارہ کرتے

ہیں اور کاموں کو اس کے نتیجوں سے پرکھ کر کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس وقت کے حالات کا جائزہ لینے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز کا انگریزی زبان اور جدید تعلیم حاصل کرنے کو جائز قرار دینے کے ماوراکئی ایک وجوہات تھیں، ایک یہ کہ اس کے فوائد دوررس اور نقصان سے زیادہ نفع بخش ہو سکتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک دہلی کے مسلمان سیاسی اعتبار سے انگریزوں سے زیادہ سکھوں، روہیلیوں اور مراٹھوں سے خطرات محسوس کر رہے تھے، اسی طرح تیسری وجہ یہ تھی جس جانب سید احمد نے اشارہ کیا ہے کہ اس دور میں برطانوی تعلیمی نظام عمدہ اور معیاری تھا۔ بہرحال جدید تعلیم کبھی بھی مذہب اسلام سے متصادم نہیں رہا ہے اور شاہ عبدالعزیز کے فتاوی اسی جانب اشارہ کر رہے ہیں مگر مسلمانوں کا عمل اس کے برعکس ہونے کی وجہ سے زبوں حالی کے شکار رہتے رہے ہیں۔

مراجع

۱ ان کا نام بی بی ارادت بنت ثناء اللہ سونی پتی ہے۔(ندوی، سید ابوالحسن علی حسنی، تاریخ دعوت وعزیمت، جلد: پنجم، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام (لکھنؤ) ۲۰۱۰ء، ص:۱۰۶-۱۰۵

۲۔ ڈار، ثریا، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کی علمی خدمات، ادارہ ثقافت اسلامیہ (لاہور) ۱۹۹۱ء، ص:۱۰۴-۱۰۳

۳۔ حوالہ سابق

۴۔ حوالہ سابق، ص:۲۰-۱۷

۵۔ حوالہ سابق، تاریخ دعوت وعزیمت، ص:۳۷۲-۳۶۵

۶۔ دہلوی، عبدالعزیز محدث، فتاویٰ عزیزی (مترجم: حاجی محمد زکی عفی)، سعید کمپنی (کراچی) ۱۴۰۸ھ، ص:۴۵۵

۷۔ اکرام، شیخ محمد، رود کوثر، تاج کمپنی (دہلی) ۲۰۰۴ء، ص:۵۸۸

۸۔ حوالہ سابق، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کی علمی خدمات، ص:۲۵۲-۲۵۱

۹۔ حوالہ سابق، ص:۲۷۱-۲۶۷

۱۰۔ حوالہ سابق، فتاویٰ عزیزی، ص:۵۹۹-۵۹۸

۱۱۔ حوالہ سابق، ص:۶۰۰-۵۹۸

۱۲۔ گیلانی، مولانا منظر احسن، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ندوۃ المصنفین (دہلی) ص:۴۲-۸۳

13. Lahiri, Pradip Kumar, Bengali Muslim Thought, 1818-1947, K.P. Bagchi &Company, 1991, P:66.

۱۴۔ خان، سر سید احمد، اسباب بغاوت ہند، اردو اکیڈمی، سیدھ (کراچی) ۱۹۵۷ء، ص:۱۲۵

۱۵۔ خان سرسید احمد،علوم جدیدہ، رسالہ تہذیب الاخلاق،۲،۱۸۷۲ء،ص:۳۲۴

16. Paranjpye, R. P., The Crux of the Indian Problem, Watts &Co., London, P:93.

۱۷۔ فاروقی،عمادالحسن آزاد، ہنداسلامی تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر (نئی دہلی) ۱۹۸۵ء،ص:۸۶

۱۸۔ حوالہ سابق، اسباب بغاوت ہند،ص:۲۶

۱۹۔ حوالہ سابق، رودکوثر،ص:۵۹۱

۲۰۔ خلیفہ اعظم مرزا مظہر جان جاناں اور احادیث پر درک رکھنے والے شاہ عبدالعزیز کے شاگردوں میں ایک بڑا نام ہے۔حوالہ سابق، تاریخ دعوت وعظیمت،ص:۱۱۶،۳۵۸

۲۱۔ وہ شاہ عبدالعزیز کے داماد اور قابل شاگرد تھے۔(شاہ عبدالعزیز، عجالہ نافعہ (مترجم: مولانا محمد عبدالحلیم چشتی)، مکتبہ الحمد العلمیہ، بہار،ص:۲۷/ حوالہ سابق، تاریخ دعوت وعزیمت،ص:۳۷۷) وہ لکھنؤ کے قیام کے دوران وعظ و نصیحت بھی کیا کرتے تھے۔سید ابوالحسن علی ندوی، سیرت سید احمد شہید، نامی پریس (لکھنؤ)۱۹۳۹ء ص:۳۶۹

۲۲۔ حوالہ سابق، فتاویٰ عزیزی،ص:۶۰۱-۶۰۰

۲۳۔ سورہ یوسف، آیت:۵۵-۵۴

۲۴۔ **البیضاوی، ابوالخیر عبداللہ، انوار التنزیل و اسرار التاویل، االجز الثالث، دار احیاء التراث العربی (بیروت)** ص:۱۶۸

۲۵۔ حوالہ سابق، فتاویٰ عزیزی،ص:۶۰۲-۶۰۱

۲۶۔ حوالہ سابق، رودکوثر،ص:۵۸۸ [تفضّل حسین (م۱۸۰۰) حکومت اودھ کے وزیر اعظم، انگریزی، ریاضی، اور دیگر سائنسی علوم کے ماہر تھے]

An Extract from the Asiatic Annual Register)1803(, Cadel & Davies, London, 1804, P:9.

۲۷۔ حوالہ سابق، فتاویٰ عزیزی،ص:۶۰۴-۵۹۸

۲۸۔ حوالہ سابق،ص:۶۰۹

۲۹۔ حوالہ سابق،ص:۴۱۷

۳۰۔ حوالہ سابق،ص:۴۱

۳۱۔ ملفوظات عزیزی (اردو)، جامع: مولوی محمد حنیف، مطبع ہاشمی (میرٹھ) ص:۱۹۰

۳۲۔ حوالہ سابق، رودکوثر،ص:۵۹۰

انوار حسین *

فقہا اور متکلمین کی کتب اصول میں 'نہی' کی بحث کا تقابلہ مطالعہ

نہی کا لغوی مفہوم

لغت میں نہی کے معنی منع کرنے اور روکنے کے ہیں۔ مولانا وحید الزماں قاسمی نے نہی کے لغوی معنی یوں بیان کیے ہیں: روکنا، جھڑکنا، خدا کا کسی کو کسی چیز سے روکنا، اس کے لیے وہ چیز حرام کر دینا۔[1]

نہی اور علمائے اصول

اصولِ فقہ میں نہی خاص کی اقسام میں سے ہے۔ علامہ عبدالعزیز بخاریؒ نے نہی کی تعریف اس طرح بیان کی ہے: **النهی فی اللغة المنع و منه النهية للعقل لأنه مانع عن القبیح**.[2] لغت میں نہی کے معنی روکنے کے ہیں۔

علامہ عبدالعزیز بخاریؒ نے اصول بزدوی کی شرح کشف الاسرار میں نہی کی متعدد تعریفات

☆ پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر پنجاب یونیورسٹی (لاہور) و لیکچرر شعبہ علوم اسلامیہ، امپیریل یونیورسٹی، لاہور (پاکستان)

نقل بھی کی ہیں۔مثلاً فرماتے ہیں:

هو استدعاء ترک الفعل بالقول ممن هو دونه وقیل هو قول القائل لغیره لا تفعل علی جهة الاستعلاء وقیل هو اقتضاء کف عن فعل علی جهة الاستعلاء. [۳]

بذریعہ قول اپنے غیر سے ترک فعل کی استدعا کرنا نہی کہلاتا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ علی سبیل الاستعلاء (دھمک سے) قائل کا اپنے غیر سے لا تفعل کہنا نہی ہے۔جب کہ دوسرے قول کے مطابق علی سبیل الاستعلاء فعل سے باز رہنے کا مطالبہ کرنا نہی کہلاتا ہے۔

علامہ سرخسیؒ نے نہی کی تعریف یوں بیان کی ہے:

والنهی لطلب مقتضی الامتناع عن الایجاد علی ابلغ الوجوه مع بقاء اختیار للمخاطب فیه وذلک بوجوب الانتهاء. [۴]

بہترین انداز میں کسی کام کو کرنے سے روکنے کا مطالبہ کرنا نہی کہلاتا ہے باوجود اس کے کہ مخاطب کے لیے اس کام کے کرنے کا اختیار باقی ہو اور یہ نہی ترک فعل کے لزوم کو ثابت کرتی ہے۔

علماء اصول کی اصطلاح میں نہی کے معنی اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر دوسرے کو **لاتفعل** کہنا ہے۔ **لاتفعل** سے واحد مذکر حاضر کا صیغہ مراد نہیں ہے بلکہ ہر وہ صیغہ مراد ہوتا ہے جو کف (روکنا) پر دلالت کرے۔صیغہ امر کی طرح صیغہ نہی بھی خاص ہے کیونکہ صیغہ نہی ایسا لفظ ہے جو معنی معلوم یعنی تحریم کے لیے وضع کیا گیا ہے۔

امام قرافیؒ نہی کی تعریف ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں:"**هو اللفظ الموضوع لطلب الترک طلبا جاز ما**". [۵] یعنی جو لازمی طور پر ترک کرنے کے لیے وضع کیا گیا۔

امام غزالیؒ نے نہی کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے:"**والنهی هو القول المقتضی ترک الفعل**" [۶] اور نہی وہ مقتضی کا قول ہے فعل کے ترک کے لیے۔

پس امر کی طرح نہی بھی خاص ہے کیونکہ صیغہ نہی معنی معلوم کے لیے وضع کیا جاتا ہے۔اپنے

کو بڑا سمجھتے ہوئے غیر کو لاتفعل (مت کر) کہنا نہی کے زمرہ میں شامل ہے۔

طلب کف (روکنا) پر دلالت کے صیغے

طلب کف یعنی عدم مطالبہ فعل کے صیغہ کی کئی شکلیں ہیں:

- فعل نہی ہو، زیادہ تر یہی صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے

  وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ.[۷]

  اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔

- امر کا صیغہ جو طلب کف پر دلالت کرے۔ جیسے:

  فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ.[۸]

- نہی کا مادہ استعمال کیا گیا ہو اگر چہ فعل نہی کا صیغہ نہ ہو۔

  وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ.[۹]

  اور بے حیائی اور نامعقول کاموں اور سرکشی سے منع کرتا ہے۔

- جملہ خبریہ ہو لیکن حرمت کا ذکر ہو یا حلت کی نفی ہو۔ جیسے:

  حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَاۗىِٕكُمْ.[۱۰]

  تم پر تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور رضاعی بہنیں اور ساسیں حرام کر دی گئی ہیں۔

فعل نہی کا استعمال

فعل امر کی طرح فعل نہی کا استعمال بھی ایک سے زائد معنوں میں ہوتا ہے۔ مثلاً تحریم، نصیحت کے لیے، شفقت کے اظہار کے لیے، کراہت کے لیے اور انجام وغیرہ کے بیان کے لیے۔ کشف الاسرار میں فعل نہی کے استعمال کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

ثم صيغة النهيوإن كانت مترددة بين التحريم كقوله تعالىٰ: وَلا تَقْرَبُوا الزِّنَى(الاسراء: ۳۲) والكراهة كقوله تعالىٰ:وَذَرُوا الْبَيْعَ(الجمعة: ۹) إذ معناه ولا تبايعوا والتحقير كقوله تعالىٰ:وَلا تَمُدَّنَ عَيْنَيْكَ(طه: ۱۳۱) الآية وبيان العاقبة كقوله تعالىٰ:وَلا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلاً(إبراهيم: ۴۲) والدعاء كقول الداعي لا تكلني إلى نفسي والتآسي كقوله تعالىٰ:لا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ (التحريم:۷) والإرشاد كقوله تعالىٰ:لا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ (المائدة:۱۰۱) والشفقة كقوله عليه السلام: "لاتتخذوا الدواب كراسي" فهي مجاز في غير التحريم والكراهة بالاتفاق. [۱۱]

نہی کا صیغہ ان معانی متعددہ کا احتمال رکھتا ہے۔تحریم کا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:(**وَلا تَقْرَبُوا الزِّنَى**) کراہیت کا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:(**وَذَرُوا الْبَيْعَ**)جس کا معنیٰ ہے آپس میں بیع نہ کرو،تحقیر کا جیسا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:(**وَلا تَمُدَّنَ عَيْنَيْكَ**)انجام کے بیان کا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:(**وَلا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غافلا**)دعا کا جیسا کہ دعا کرنے والا کہتا ہے(**لا تكلني إلى نفسي**)مایوسی کے لیےجیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:(**لا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ**)نصیحت کے لیےجیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:(**لا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ**)شفقت کےاظہار کے لیے(**لاتتخذوا الدواب كراسي**)تحریم اور کراہت کے علاوہ نہی کے معنی مجازی معنی ہیں۔

فعل نہی کا حقیقی استعمال

جمہور فقہاء کے نزدیک 'نہی' کا استعمال تحریم میں حقیقت ہے اور بعض کے نزدیک کراہت

میں حقیقت ہے اور بعض کے نزدیک دونوں میں مشترک ہے۔ علامہ عبدالعزیز بخاریؒ اصول بزدوی کی شرح میں تحریر کرتے ہیں:

> **ومقتضى النهي شرعا قبح المنهي عنه كما أن مقتضى الأمر حسن المأمور به لأن الحكيم لا ينهى عن فعل إلا لقبحه كما لا يأمر بشيء إلا لحسنه قال تعالى: وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (النحل: ۹۰) فكان القبح من مقتضياته شرعا لا لغة.** [۱۲]
>
> اور نہی کا اقتضاء منہی عنہ کی شرعی قباحت ہے۔ جیسا کہ امر کا مقتضیٰ مامور کام کا حسن ہے، کیوں کہ حکیم ذات کسی فعل سے منع نہیں کرتی مگر اس کی قباحت کے باعث اور اسی طرح کسی چیز کا حکم نہیں کرتی مگر اس کے حسن وعمدگی کے باعث۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ) اس کا قبح شرعی ہوگا نہ کہ لغوی۔

اصول الشاشی[۱۳] اور **نور الانوار**[۱۴] میں بھی فعل نہی کا حقیقی استعمال تحریم کے لیے ہی ذکر ہوا ہے۔ مالکی فقیہ امام قرافیؒ لکھتے ہیں کہ **النهي عندنا للتحريم**[۱۵] یعنی نہی ہمارے نزدیک تحریم کے لیے ہے۔ حاصل یہ کہ جمہور فقہاء کے نزدیک 'نہی' کا استعمال تحریم میں حقیقت ہے۔

نہی کے اقسام

علماء اصول نے نہی کی دو قسمیں ذکر کی ہیں۔ مصنف اصول الشاشیؒ لکھتے ہیں:

> **والنهي نوعان نهي عن الأفعال الحسية كالزنا وشرب الخمر والكذب والظلم ونهي عن التصرفات الشرعية كالنهي عن الصوم في يوم النحر والصلوة في الأوقات المكروهة وبيع الدرهم بالدرهمين.** [۱۶]
>
> نہی کی دو قسمیں ہیں، ایک افعال حسیہ سے نہی جیسے زنا، شراب نوشی، جھوٹ اور ظلم اور دوسرا تصرفات شرعیہ سے نہی جیسے یوم نحر میں روزے سے نہی

اوراوقات مکروہ میں نماز سے نہی اورایک درہم کودودرہم کے عوض بیچنے کی نہی۔

نورالانوار میں بھی یہی تقسیم ذکر کی گئی ہے۔شارح نورالانوارافعال حسیہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

افعال حسیہ سے مراد یہ ہے کہ ان افعال کے معانی،ورود شرع سے پہلے ہی سے ہوں اورتاہنوزاپنے حال پر باقی ہوں۔شریعت کی وجہ سےان میں کوئی تغیر پیدانہ ہواہوجیسےقتل،زنااورشراب پیناوغیرہ۔[۱۷]

ابن حبیب الحلبی نے بھی انہی دواقسام کا تذکرہ کیاہے۔

والنهی عن الافعال الحسية من الاول وعن الشرعية من الثانی. [۱۸]

اورنہی اول قسم یعنی افعال حسیۃ سے نہی اوردوسری قسم یعنی افعال شرعیہ سے نہی۔

نہی کی دواقسام یعنی افعال حسیہ میں نہی اورتصرفات شرعیہ میں نہی میں تقسیم کیاجاتا ہےاور اس میں کوئی اختلاف موجودنہیں۔

نہی اورصفت قبح

نہی میں صفت قبح کبھی عین میں پائی جاتی ہےاورکبھی معنی غیرہ میں پائی جاتی ہے۔وضاحت درج ذیل ہے:

النهی. وينقسم فی صفة القبح كالامر فی الحسن. الاول ماقبح لمعنی فی عينه وضعاً اوشرعاً. والثانی ماقبح لمعنی فی غيره وصفاً ومجاوراً. [۱۹]

یعنی نہی اوراس میں قبح کی صفت پائی جاتی جس طرح امر میں حسن کی صفت پائی جاتی۔پہلا یعنی عین میں قبح اوریہ یاوضعی ہوتاہے یاشرعی اوردوسرا یعنی معنی فی غیرہ میں قبح کاپایاجانااوریہ یاصفتاً ہوتاہے یامجاوراً ہوتاہے۔

اس عبارت کا مقصد یہ ہے کہ شارع جس چیز سے منع کرتا ہے،اس شے میں قبح یاتو عین میں موجود ہوتا ہے یامعنی میں موجود ہوتا ہے۔اگر قبح عین میں موجود ہوتواس کی دواقسام ہیں۔اول

وضعی اور دوسری شرعی۔

- وضعی کی مثال کفر ہے یعنی کفر میں قبح کی صفت وضعاً پائی جاتی ہے، اسی لیے کافر کو کافر کہا جائے تو وہ چیخ اٹھتا ہے اور جدید متجد دین کافر کی بجائے غیر مسلم کا لفظ استعمال کرتے ہیں تا کہ ان کی طبیعت پر گراں نہ گزرے۔
- شرعی کی مثال محدث (غیر ظاہر) کی نماز ہے، یعنی اس میں وضعاً قباحت نہیں مگر شرعاً قباحت موجود ہے۔ اہلیت ادا متاثر ہوتی ہے۔

'**قبح لمعنی فی غیرہ**' کی دو اقسام میں صفتاً اور مجاوراً بیان کی گئی ہیں۔ ان کی وضاحت درج ذیل ہے:

- صفتاً کی مثال یوم النحر میں روزہ رکھنا۔ روزہ رکھنا اپنی ذات میں اچھا فعل ہے لیکن عید والے دن روزہ رکھنا منع ہے اور اگر کوئی رکھ لے تو روزہ نہیں ہوگا۔
- مجاوراً کی مثال یہ ہے کہ جمعہ کے دن اذان جمعہ کے وقت اور اس کے بعد بیع سے روکا گیا ہے اور سعی للجمعہ کی ترغیب دی گئی ہے۔ البتہ نماز جمعہ کے بعد بیع میں مشغول ہو جانے کی اجازت ہے۔ لہٰذا بیع اپنی ذات میں منع نہیں لیکن مجاوراً منع ہے۔

نور الانوار کے مصنفؒ لکھتے ہیں:

وانه یقتضی صفة القبح للمنهی عنه. [۲۰]

اور نہی، منہی عنہ کے لیے صفت قبح کا تقاضا کرتی ہے۔

نور الانوار میں بھی نہی کی یہی تقسیم کی گئی ہے۔ غرض یہ کہ فقہاء اور متکلمین کے نزدیک اس بات پر اتفاق ہے کہ شارع نے کسی فعل سے اس لیے منع کیا کہ وہ فعل قبیح ہے، یعنی جو قبح نفس الامر میں موجود ہوتا ہے شارع نہی کے ذریعہ اس کو ظاہر کر دیتا ہے۔

نہی قبح کا تقاضا کرتا ہے

نہی میں صفت قبح موجود ہوتی ہے اس میں فقہاء اور متکلمین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہی فساد کا تقاضا کرتا ہے۔

امام الحرمین لکھتے ہیں:

والنهی استدعاء الترک بالقول ممن هو دونه علیٰ سبیل الوجوب ویدل علی فساد المنهی عنه. [۲۱]

یعنی اور نہی اپنے سے کم تر کو علیٰ سبیل الوجوب ترک کرنے کا حکم دینا ہے اور یہ منہی عنہ کے فساد پر دلالت کرتا ہے۔

نورالانوار کے مصنفؒ لکھتے ہیں:

وانه یقتضی صفة القبح للمنهی عنه ضرورة حکمة الناهی والحکیم انما ینهی عن الفحشاء ولمنکر. [۲۲]

اور نہی، منہی عنہ کے لیے صفت قبح کا تقاضا کرتی ہے اس لیے کہ ناہی کی حکمت بدیہی ہے اور حکیم بے حیائی اور بری باتوں سے روکتا ہے۔

علامہ جصاصؒ لکھتے ہیں:

هَذَا مَذْهَبُ السَّلَفِ وَفُقَهَاءِ الْأَمْصَارِ لَا نَعْلَمُ أَنَّ أَحَدًا مِنْهُمْ قَالَ: إنَّ النَّهْيَ لَا يَدُلُّ عَلَى فَسَادِ. [۲۳]

یہ سلف کا مذہب ہے اور فقہاء امصار کا بھی، ہم نہیں جانتے کہ ان میں سے کسی نے کہا ہو کہ نہی فساد پر دلالت نہیں کرتا۔

ابواسحاق الشیرازی کے بقول:

والنهی یدل علی فساد المنهی عنه [۲۴]

اور نہی، منہی عنہ کے فساد پر دلالت کرتا ہے۔

جس چیز سے روکا گیا اگر اس کے اندر فساد نہ ہو تو شارع اس سے منع کیوں کر کرے گا، لہٰذا اس امر پر اتفاق ہے کہ نہی، منہی عنہ کے فساد پر دلیل ہے۔

خلاصہ کلام

نہی اور اس سے متعلق مباحث کو درج ذیل نکات کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے:

- لغت میں نہی کے معنی منع کرنے اور روکنے کے ہیں۔
- علماء اصول کی اصطلاح میں نہی کے معنی اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر دوسرے کو **لاتفعل** کہنا ہے۔
- **لاتفعل** سے واحد مذکر حاضر کا صیغہ مراد نہیں ہے بلکہ ہر وہ صیغہ مراد ہوتا ہے جو کف پر دلالت کرے۔ صیغہ امر کی طرح صیغہ نہی بھی خاص ہے کیونکہ صیغہ نہی ایسا لفظ ہے جو معنی معلوم یعنی تحریم کے لیے وضع کیا گیا ہو۔
- فعل امر کی طرح فعل نہی کا استعمال بھی ایک سے زائد معنوں میں ہوتا ہے۔ مثلاً تحریم، نصیحت کے لیے، شفقت کے اظہار کے لیے، کراہت کے لیے اور انجام وغیرہ کے بیان کے لیے۔
- نہی کے حقیقی استعمال کے ضمن میں علمائے اصول کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک نہی کراہت میں حقیقت ہے اور بعض کے نزدیک کراہت اور تحریم میں مشترک ہے لیکن جمہور فقہاء کے نزدیک 'نہی' کا استعمال تحریم میں حقیقت ہے۔
- نہی کی دو اقسام یعنی افعال حسیہ میں نہی اور تصرفات شرعیہ میں نہی میں تقسیم کیا جاتا ہے اور اس میں کوئی اختلاف موجود نہیں۔
- نہی میں صفت قبح موجود ہوتی ہے، اس میں فقہاء اور متکلمین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔
- جس چیز سے روکا گیا اگر اس کے اندر فساد نہ ہو تو شارع اس سے منع کیوں کر کرے گا، لہٰذا اس امر پر اتفاق ہے کہ نہی، منہی عنہ کے فساد پر دلیل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ کیرانوی، وحیدالزماں، **القاموس الوحید**، ادارہ اسلامیات (لاہور) ۲۰۰۱ء، ص: ۱۷۱۹ء

۲۔ بخاری، عبدالعزیز بن احمد، **کشف الاسرار عن اصول فخر الاسلام البزدوی**، دار الکتب العلمیة (بیروت) ۱۹۹۷ء، ج: ۱، ص: ۳۷۶

۳۔ **کشف الاسرار**، ج: ۱، ص: ۳۷۶

۴۔ سرخسی، محمد بن احمد، اصول السرخسی، **دار الکتاب العلمیة** (بیروت) ۱۹۹۳ء، ج: ۱، ص: ۹۵

۵۔ قرافی، شہاب الدین، **تنقیح الفصول**، **دار الفکر** (عمان) ۲۰۰۸ء، ص: ۴۳

۶۔ غزالی،محمد بن احمد،ابوحامد،المستصفیٰ فی الاصول،دار الکتب العلمیة(بیروت)۱۹۹۳ء،ص:۲۰۲
۷۔ سورۃ البقرۃ:۲/۱۸۸
۸۔ سورۃ الحج:۲۲/۵۷
۹۔ سورۃ النحل:۱۶/۹۰
۱۰۔ سورۃ النسآء:۴:۲۳
۱۱۔ کشف الاسرار،ج:۱،ص:۳۷۴
۱۲۔ کشف الاسرار،ج:۱،ص:۳۷۴
۱۳۔ اصول الشاشی،ص:۱۶۵
۱۴۔ ملاجیون،نور الانوار شرح رسالة المنار،مکتبة البشریٰ(کراچی)۲۰۰۸ء،ج:۱،ص:۱۸۰-۱۷۵
۱۵۔ تنقیح الفصول فی الاصول،ص:۴۶
۱۶۔ اصول الشاشی،ص:۱۶۵
۱۷۔ سکروڈوی،جمیل احمد،مولانا،قوت الاخیار شرح اردو نور الانوار،المیزان(لاہور)۲۰۰۴ء،ج:۱، ص:۳۲۵
۱۸۔ الحلبی،ابن حبیب،مختص المنار،دار صادر(بیروت)۲۰۰۶ء،ص:۷
۱۹۔ الحلبی،ابن حبیب،مختص المنار،ص:۷
۲۰۔ ملاجیون،نور الانوار شرح رسالة المنار،مکتبة البشریٰ(کراچی)۲۰۰۸ء،ج:۲،ص:۱۸۰-۱۷۵
۲۱۔ الجوینی،امام الحرمین،الورقات فی اصول الفقه،مکتبه الوداعی،صنعاء،۲۰۱۰ء،ص:۳۰
۲۲۔ نور الانوار،ج:۱،ص:۱۸۱-۱۷۶
۲۳۔ الجصاص،احمد بن علی الرازی،الفصول فی الاصول، وزارة الأوقاف والشئون الإسلامیة دولة، الکویت،ج:۲،ص:۱۷۶
۲۴۔ الشیرازی،ابواسحاق ابراہیم بن علی،اللمع فی اصول الفقه،وار الکتب العلمیة(بیروت) ۱۹۸۵ء،ص:۱۲